مؤلفین

☆ پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحسن:
شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

☆ ڈاکٹر محمد صالح طاہر:
ممبر انکوائری، (ایس اینڈ جی اے ڈی) حکومت پنجاب، لاہور

☆ پروفیسر ڈاکٹر آصف اعوان:
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج فیصل آباد یونیورسٹی، فیصل آباد

☆ پروفیسر محمد نعیم بزمی:
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ

☆ پروفیسر اسد ایوب نیازی:
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ سائنس کالج علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

مدیران

☆ پروفیسر اسد ایوب نیازی
☆ پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحسن

ناشر: چودھری غلام رسول اینڈ سنز، لاہور۔ ڈیزائننگ: محمد قاسم

مطبع: اے۔وائی۔ پرنٹرز، لاہور۔

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	تعداد	قیمت
مارچ 2016ء	اول		

حُسنِ ترتیب

نمبر شمار	عنوانات	مصنّفین/شعرا	صفحہ نمبر
	حصّۂ نثر		
۱	ہجرتِ نبوی صَلَّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم	مولانا شبلی نعمانیؒ	۲
۲	مرزا غالبؔ کے عادات وخصائل	مولانا الطاف حسین حالیؔ	۸
۳	کاہلی	سرسیّد احمد خان	۱۵
۴	شاعروں کے لطیفے	مولانا محمد حسین آزادؔ	۲۱
۵	نصوح اور سلیم کی گفتگو	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۲۸
۶	پنچایت	منشی پریم چند	۳۶
۷	آرام وسکون	سیّد امتیاز علی تاج	۴۷
۸	لہو اور قالین	میرزا ادیب	۵۷
۹	امتحان	مرزا فرحت اللہ بیگ	۷۰
۱۰	ملکی پرندے اور دوسرے جانور	شفیق الرّحمان	۷۹
۱۱	قدرِ ایاز	کرنل محمد خان	۸۷
۱۲	حوصلہ نہ ہارو آگے بڑھو منزل اب کے دور نہیں	تیار کردہ: پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور	۹۷
	حصّۂ نظم		
۱۳	حمد	مولانا الطاف حسین حالیؔ	۱۰۶
۱۴	نعت	امیرؔ مینائی	۱۱۱
۱۵	برسات کی بہاریں	نظیرؔ اکبر آبادی	۱۱۵
۱۶	پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ	علاّمہ محمد اقبالؒ	۱۲۰
	حصّۂ غزل		
۱۷	ہستی اپنی حباب کی سی ہے	میر تقی میرؔ	۱۲۵
۱۸	رُخ وزلف پر جان کھو یا کیا	خواجہ حیدر علی آتشؔ	۱۳۱
۱۹	دِلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے؟	مرزا اسد اللہ خان غالبؔ	۱۳۶
۲۰	لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں	بہادر شاہ ظفرؔ	۱۴۱
۲۱	فرہنگ		۱۴۵

مولانا شبلی نعمانیؒ

(۱۸۵۷ء..........۱۹۱۴ء)

قصبہ بندول، ضلع اعظم گڑھ، بھارت میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل تھے۔شبلی نے بھی کچھ دن وکالت کی، پھر علی گڑھ کالج میں فارسی کے اُستاد مقرر ہو گئے۔وہاں انھیں سر سیّد، حالی، محسن الملک اور آرنلڈ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔۱۸۹۲ء میں آرنلڈ کے ساتھ شبلی نے مصر، شام، قسطنطنیہ اور دوسرے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ سر سیّد کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد، علی گڑھ کالج سے استعفیٰ دے کر، اعظم گڑھ چلے گئے۔ پھر حیدر آباد دکن کے دائرۃ المعارف کی نظامت کا عہدہ سنبھالا۔اسی دوران میں ان کی کوشش سے لکھنؤ میں ''ندوۃ العلما'' کا قیام عمل میں آیا۔اخیر عمر میں اعظم گڑھ میں انھوں نے ایک عظیم ادارہ ''دارالمصنّفین'' قائم کیا، جو آج بھی کام کر رہا ہے۔

شبلی شاعر بھی تھے، لیکن ان کی شہرت کا مدار زیادہ تر اُن کی نثر پر ہے۔ان کا شمار اردو کے بڑے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔

شبلی نے اگرچہ متنوع موضوعات مثلاً: تاریخ، تنقید، سوانح، سیرت، تذکرہ، ادب، معاشرت، عقائد، تصوف اور سیاست پر قلم اٹھایا مگر ان کے طرزِ اظہار میں ادبیت کی شان موجود ہے۔جوشِ بیان، ایجاز و اختصار، روانی و برجستگی، محققانہ انداز، غنائیت اور شعریت ان کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔شبلی کی تمام ادبی کاوشوں سے قطعِ نظر، ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ، ان کا اندازِ بیان ہے۔

شبلی کی متعدد تصانیف ہیں۔اہم تصانیف میں: ''شعر العجم'' (پانچ جلدیں)، ''الفاروقؓ''، ''المامون''، ''سیرۃ النعمان''، ''الغزالی''، ''سوانحِ مولانا روم''، ''سفر نامۂ روم و مصر و شام'' اور ''سیرۃ النبیؐ'' شامل ہیں۔

ہجرتِ نبوی صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم

مقاصد تدریس

۱۔ طلبہ کو تبلیغِ اسلام کی ابتدائی مشکلات سے آگاہ کرنا۔
۲۔ سیرت النبی صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور سیرت نگاری سے روشناس کرانا۔
۳۔ مذہبی الفاظ و تراکیب سے متعارف کرانا۔
۴۔ تاریخِ اسلام سے روشناس کرتے ہوئے طلبہ کے دلوں میں اسلامی جذبہ بیدار کرنا۔
۵۔ طلبہ کو بتانا کہ حق و صداقت کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس وقت جب کہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالَم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا، لیکن خود وجودِ اقدس صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم جو اُن ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لیے حکمِ خدا کا منتظر تھا۔

نبوّت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہؓ مدینے پہنچ چکے، تو وحیِ الٰہی کے مطابق: آنحضرت صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بھی مدینے کا عزم فرمایا۔ قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینے میں جا کر طاقت پکڑے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا: محمدؐ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا: جلاوطن کر دینا کافی ہے۔ ابوجہل نے کہا: ہر قبیلے سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر، تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے۔ اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آ کر رسول صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے آستانۂ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھُسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لیے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم نکلیں، تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا۔ اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپؐ کو قریش کے ارادے کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اس بنا پر جنابِ امیر حضرت علی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر فرمایا: ''مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینے روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔'' یہ سخت خطرے کا موقع تھا۔ جنابِ امیرؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا بسترِ خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتحِ خیبر کے لیے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔

کفّار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی، تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرتؐ ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبے کو دیکھا اور فرمایا: ''مکّہ! تُو مجھ کو تمام دُنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی۔ دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے عبداللہ، جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ ہوتے، صبح مُنھ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتا لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی، شام کو آ کر آنحضرتؐ سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غلام کچھ رات گئے، بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزاریں۔

صبح قریش کی آنکھیں کُھلیں، تو پلنگ پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بجائے جنابِ امیرؓ تھے۔ ظالموں نے آپؓ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غمزدہ ہوئے اور آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے، تو ہم کو دیکھ لیں۔ آپؐ نے فرمایا:

لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (سورۃ توبہ: ۴۰)

''گھبراؤ نہیں، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمدؐ کو یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اُونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جُشم نے سُنا، تو انعام کی اُمید میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپؐ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپؐ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں ''نہیں'' نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا۔ اب کی بار گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اُتر پڑا اور پھر فال نکالی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرّر تجربے نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرتؐ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھ دیا۔

تشریف آوری کی خبر مدینے میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشمِ انتظار تھا۔ معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبرؐ آ رہے ہیں۔ لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس

چلے آتے۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا: ''اہلِ عرب! لوتم جس کا انتظار کرتے تھے، وہ آ گیا۔'' تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا۔

(سیرۃ النبیؐ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) ہجرتِ نبوی صَلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے کیا مُراد ہے؟

(ب) رسولِ پاک صَلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے نبوّت کے کون سے سال ہجرت فرمائی؟

(ج) حضرتِ امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کون سی شخصیت مُراد ہے؟

(د) رسولِ پاک صَلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا ارشاد فرمایا؟

(ہ) حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون تھیں؟

(و) قریش نے رسولِ پاک صَلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گرفتار کرنے کا کیا انعام مقرر کیا؟

(ز) سراقہ بن جعشم کیسے تائب ہوا؟

۲۔ متن کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے موزوں الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان .... کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا۔
(مکّہ، مدینہ، طائف، یمن)

(ب) نبوّت کا .... سال شروع ہوا اور اکثر صحابہؓ مدینے پہنچ چکے، تو وحی الٰہی کے مطابق: آنحضرتؐ نے بھی مدینے کا عزم فرمایا۔
(بارھواں، دسواں، تیرھواں، پندرھواں)

(ج) اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی .... جمع تھیں۔
(تلواریں، امانتیں، کھجوریں، نعمتیں)

(د) .... کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں۔
(جنابِ ابوبکرؓ، جنابِ عمرؓ، جنابِ امیرؓ، جنابِ عثمانؓ)

(ہ) .... سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی۔
(حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ)

(و) اسی طرح .... راتیں غار میں گزاریں۔
(تین، چار، پانچ، سات)

۳۔ درجِ ذیل بیانات میں سے درست کی نشاندہی (✓) اور غلط کی نشان دہی (✗) سے کریں۔

(الف) دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔
(ب) حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان حبشہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا۔
(ج) نبوّت کے تیرھویں سال اکثر صحابہؓ مدینے پہنچ چکے تھے۔
(د) سب لوگوں نے ایک ہی رائے پیش کی۔
(ہ) اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے۔
(و) فاتحِ خیبر کے لیے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔
(ز) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غلام رات گئے، بکریاں چرا کر لاتا۔
(ح) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔
(ط) صبح قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بجائے جنابِ امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔
(ی) نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تشریف آوری کی خبر مدینے میں پہلے پہنچ چکی تھی۔

۴۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
دارالامان	جھنکاریں
دیانت	فرشِ گل
قتل گاہ	چشم انتظار
ہمہ تن	امانت
تلوار	مدینہ

۵۔ سبق ''ہجرتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۶۔ درجِ ذیل الفاظ وتراکیب کا تلفّظ اِعراب کی مدد سے واضح کریں۔

حافظِ عالم، وجودِ اقدس، دارالامان، قبائل، محاصرہ، عداوت، بوسہ گاہ خلائق، قتل گاہ، فرشِ گل

۷۔ درجِ ذیل کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

دعوتِ حق، ہدف، معیوب، ترکش، خون بہا

۸۔ جمع کے واحد اور واحد کی جمع لکھیں۔

ہدف، جھنکاریں، رائیں، زنجیر، قبیلہ

۹۔ درجِ ذیل اقتباس کی تشریح سیاق وسباق کے حوالے سے کریں۔

اس بنا پر جنابِ امیر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ............قتل گاہ فرشِ گُل تھا۔

۱۰۔ درجِ ذیل تراکیب کے معنی لکھیں۔

آستانۂ مبارک، بوسہ گاہِ خلائق، فرشِ گُل، گراں بہا، ہمہ تن چشمِ انتظار

سرگرمی:

۱۔ اساتذۂ کرام بچوں کو ہجرتِ مدینہ کے بارے میں کچھ واقعات سنائیں اور پھر ان کو اپنے الفاظ میں سُنانے کے لیے کہیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو ہجرتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے واقعات تفصیل سے بتائیں۔

۲۔ اس سبق کی قرأت میں تلفظ اور ادائیگی کا خاص خیال رکھیں۔

۳۔ رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے جن صحابہؓ کا ذکر اس سبق میں موجود ہے، اُن کا مختصر تعارف پیش کریں۔

۴۔ مشکل الفاظ اور تراکیب بورڈ پر اعراب کی مدد سے لکھ کر ان کی وضاحت کریں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی

(۱۸۳۷ء.........۱۹۱۴ء)

الطاف حسین حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ان کے اجداد غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہندوستان آئے۔نو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ بھائیوں نے پرورش کی۔تعلیم کی تکمیل دہلی کے عالموں کی صحبت میں ہوئی۔ غالبؔ اور شیفتہؔ کی صحبت سے بطورِ خاص فیض یاب ہوئے۔سرسیّد سے بھی تعلقِ خاطر قائم ہوا۔شیفتہؔ اور غالبؔ کے انتقال کے بعد، لاہور آئے اور یہاں پنجاب بُک ڈپو میں ملازمت کر لی۔یہیں وہ انگریزی ادبیات سے متعارف ہوئے۔جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور اردو شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔۱۸۸۷ء میں سرکارِ حیدر آباد سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوگیا، تو ملازمت ترک کر کے باقی عمر تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔

حالؔی کے اسلوبِ بیان کی سب سے نمایاں خوبی مدعا نگاری ہے۔حالؔی کی غرض، اپنے مضمون کو ادا کرنے اور مطالب کو وضاحت سے پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ان کی نثری تحریروں میں اعتدال و توازن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ بے جا اختصار اور بے جا طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے عبارت کو دلکش، سادہ اور مدلّل بنانے میں، حالؔی اپنی مثال آپ ہیں۔وہ ہر بات کو سنجیدگی اور عقلیت کے ترازو میں تولتے ہیں اور تخیل اور جذبات سے دُور رہتے ہوئے اپنے خیالات اور حقائق کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے، حالؔی کے نثری اُسلوب کو، اُردو نثر کا معیاری اُسلوب قرار دیا ہے۔

وہ سوانح نگار، مضمون نگار اور نقاد ہیں۔سرسیّد کے قریبی اور با اعتماد ساتھیوں میں تھے۔ان کی مشہور کتابوں میں ''حیاتِ جاوید''، ''یادگارِ غالبؔ''، ''حیاتِ سعدی''، ''مقدمۂ شعروشاعری'' اور ''مدوجزرِ اسلام'' شامل ہیں۔آخرالذکر کتاب ''مسدسِ حالی'' کے نام سے بے حد مقبول ہوئی۔مقدمۂ شعروشاعری (جو دراصل ان کے دیوان کا طویل دیباچہ ہے) جدید اردو تنقید کا نقطۂ آغاز ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی

مرزا غالبؔ کے عادات وخصائل

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو غالبؔ کی شخصیت اور ان کے عادات وخصائل سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو بتانا کہ خوش اخلاقی اور کشادہ پیشانی بڑے لوگوں کا شیوہ ہے۔
۳۔ خط کا جواب لکھنے کی اہمیت واضح کرنا۔
۴۔ طلبہ کو بتانا کہ ہمارے بزرگ کتنے وضع دار اور بامروّت تھے۔
۵۔ طلبہ کو ادبی قسم کے الفاظ وتراکیب سے روشناس کرانا۔

مرزا غالبؔ کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے ملتا، اسے ہمیشہ ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست، ہر مذہب اور ملّت کے، نہ صرف دِلّی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، ان کے ایک ایک حرف سے مہر ومحبت، غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا اپنے ذمّے فرضِ عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کو جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی، وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں، ان کے بعض خالص ومخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تکمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے، مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا، تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں: ''جہاں تک ہوسکا، احباب کی خدمت بجالایا اوراوراقِ اشعار دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سُوجھے اور نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔''

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ اُن کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لُولے اور اپاہج مرد عورت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہوگئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔

مرزا اپنے دوستوں کے ساتھ، جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دِلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دِلی دوست تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی حالت سقیم ہوگئی تھی، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے

ہوئے مرزا سے ملنے آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ چوغوں کے سوا، ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا: ''یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔'' انھوں نے کہا: ''یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے۔ میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔'' مرزا نے کہا: ''جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدّت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔'' پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چوغہ اُتار کر انھیں پہنایا اور اس خوب صورتی کے ساتھ وہ چوغہ ان کی نذر کیا۔

ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر آپ کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا: ''مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟'' عرض کیا: ''پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔'' ایک دن نواب مصطفیٰ خان کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتا تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا:

ع آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکیست[1]

جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دالان میں بہ سبب مشرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا:

ع ایں خانہ ہمہ آفتاب است[2]

ایک صحبت میں مرزا، میر تقی میرؔ کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ بھی موجود تھے۔ انھوں نے سوداؔ کو میرؔ پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا: ''میں تو تم کو میری سمجھتا ہوں مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔''

باوجود یکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ شہر کے امرا و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہ نکلتے تھے۔ عمائدِ شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر آتے تھے، یہ بھی ان کے مکان پر ضرور جاتے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا: ''آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟'' مرزا صاحب نے کہا: ''مجھ کو فلاں صاحب کا ایک آنا دینا تھا۔ اوّل وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔''

ایک دن دیوان فضل اللہ مرحوم چرٹ میں سوار مرزا صاحب کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں

۱۔ آبِ حیات اندھیرے میں ہے۔

۲۔ یہ گھر تو سارے کا سارا سورج ہے۔

نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا۔ مضمون یہ کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

فواکہ میں آم ان کو بہت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دُور دُور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعض دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔ ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے، باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدر ہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آ سکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا: ''مرزا! اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟'' مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: ''اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔'' بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

مرزا کی نیّت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہلِ شہر تحفتاً بھیجتے تھے۔ خود بازار سے منگواتے تھے۔ باہر سے دُور دُور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور دیگر احباب موجود تھے اور آم کی نسبت ہر ایک شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا: ''بھئی! میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔'' سب حاضرین ہنس پڑے۔

(یادگارِ غالبؔ)

مشق

ا۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) مرزا غالبؔ کیسے اخلاق کے مالک تھے؟
(ب) دوستوں کو دیکھ کر غالبؔ کی حالت کیا ہوتی تھی؟
(ج) مرزا غالبؔ کو کہاں کہاں سے خط آتے تھے؟
(د) اکثر لوگ غالبؔ کو کس طرح کے خط بھیجتے تھے؟
(ہ) سائلوں کے ساتھ مرزا غالبؔ کا سلوک کیسا تھا؟
(و) دوستوں کے ساتھ مرزا غالبؔ کا سلوک کیسا تھا؟
(ز) مرزا غالبؔ کے مزاج کی خاص خوبی کیا تھی؟
(ح) مرزا غالبؔ کو کون سا پھل پسند تھا؟
(ط) سبق ''مرزا غالبؔ کے عادات وخصائل'' کس کتاب سے لیا گیا ہے؟
(ی) سبق ''مرزا غالبؔ کے عادات وخصائل'' کے مصنف کون ہیں؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

کشادہ پیشانی، باغ باغ ہونا، مخلص، گردشِ روزگار، سیر ہو جانا، زمین میں گڑ جانا

۳۔ مندرجہ ذیل جملوں کو مکمل کریں۔

(الف) مرزا غالبؔ کے اخلاق نہایت............ تھے۔

(ب) دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی............ نہ ہوتے تھے۔

(ج) خودداری اور حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے............ تھے۔

(د) فواکہ میں............ ان کو بہت مرغوب تھا۔

(ہ) مرزا کی نیّت............ سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔

۴۔ سبق کے متن کو مدِّنظر رکھ کر درست جواب کی (✓) سے نشاندہی کریں۔

(الف) مرزا غالبؔ کے نہایت وسیع تھے:

(i) اخلاق (ii) افکار
(iii) خصائل (iv) کردار

(ب) مرزا غالبؔ دوستوں کی کن باتوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے؟

(i) بُری باتوں سے (ii) زیادتیوں سے
(iii) فرمائشوں سے (iv) حرکتوں سے

(ج) لوگ اکثر مرزا غالبؔ کو خط لکھتے تھے:

(i) محبت بھرے (ii) دُکھ بھرے
(iii) بیرنگ (iv) طویل

(د) مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا:

(i) جود و سخا (ii) اخلاص
(iii) مروّت اور لحاظ (iv) صبر

(ہ) ایک صحبت میں مرزا غالبؔ کس کی تعریف کر رہے تھے؟

(i) ذوقؔ کی (ii) مومنؔ کی
(iii) بہادر شاہ ظفرؔ کی (iv) میر تقی میرؔ کی

(و) کس نے سوداؔ کو میرؔ پر ترجیح دی؟

(i) ذوقؔ نے (ii) غالبؔ نے
(iii) مومنؔ نے (iv) شیفتہؔ نے

(ز) فواکہ میں غالب کو بہت مرغوب تھا۔

(i) خربوزہ (ii) تربوز

(iii) آم (iv) آڑو

۵۔ اِعراب لگا کر تلفّظ واضح کریں۔

اخلاق، مروت، اصلاح، وضع، عمائد

۶۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
اخلاق	ملّت
خوشی	لحاظ
مذہب	وسیع
مروّت	ٹکٹ
بیرنگ	حیوان ظریف
حیوان ناطق	غم

۷۔ مذکر اور مؤنث الفاظ الگ الگ کر کے لکھیں۔

غم، خوشی، خط، مذہب، ملت، حرف، غزل، مروّت، لحاظ، ٹکٹ، حوصلہ، وضع، جاڑا، ظرافت

مختلف اندازِ بیان میں امتیاز کرنا:

جملوں پر غور کیجیے۔

(الف) پاکستان کو ۲۰۰۰ میگاواٹ بجلی کی کمی کا سامنا ہے۔

(ب) چٹھی نمبری ۲۱۵/ای کے تحت، علی کی خدمات محکمۂ تعلیم کے سپرد کی جاتی ہیں۔

(ج) قرار دیا جاتا ہے کہ فلاں ابن فلاں تعزیراتِ پاکستان دفعہ فلاں کے تحت فلاں جرم کا مرتکب ہوا ہے۔

(د) کمپیوٹر کا ہارڈ ویئر اس کا دماغ اور سافٹ ویئر اُس کا ذہن ہے۔

(ہ) اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے، ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔

آپ نے غور کیا کہ یہ پانچوں جملے اردو زبان میں ہونے کے باوجود اپنے لہجے، تیور، اسلوب اور لفظوں کے انتخاب کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اختلاف کا سبب ایک طرف وہ بات یا مفہوم ہے، جسے اظہار میں لانا مقصود ہے اور دوسری طرف وہ حقیقی یا فرضی سامعین / قارئین ہیں، جن تک بات پہنچانا مقصود ہے۔ گویا مافی الضمیر اور مخاطبین کو لحاظ میں رکھ کر مخصوص پیرایۂ اظہار کا

انتخاب کیا جاتا ہے۔ پہلا جملہ کسی اخباری خبر ہے، اس لیے اسے صحافتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ صحافتی پیرایۂ بیان سادہ ہوتا ہے کہ اخبار کے قارئین میں ہر طرح کے اور ہر ذہنی سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرا جملہ دفتری زبان کا ہے۔ دفتری زبان کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں، جنھیں دفتر سے متعلق لوگ سمجھتے ہیں۔ تیسرا جملہ قانونی اور عدالتی زبان کا ہے۔ قانون اور عدالت کی مخصوص زبان ہوتی ہے، مخصوص لفظیات اور اصطلاحات ہوتی ہیں، جن کے مفاہیم و مطالب طے شدہ ہوتے ہیں اور ابہام سے یک سر پاک ہوتے ہیں۔ چوتھا جملہ تکنیکی زبان کا ہے۔ ہر شعبۂ علم کی خاص زبان ہوتی ہے۔ طِب، انجینئرنگ، کامرس، طبیعیات، حیاتیات، فلکیات، ان سب کی جدا جدا زبان ہے اور ہر ایک کی الگ الگ اصطلاحات ہیں، جنھیں متعلقہ شعبۂ علم کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر متعلقین ہی سمجھتے ہیں۔

غور کریں تو آخری جملہ، دیگر تمام جملوں سے مختلف ہے۔ دیگر جملوں کے مفہوم میں قطعیت اور کامل وضاحت ہے، مگر آخری جملے میں ہلکا سا ابہام ہے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ باقی جملوں میں ایک قسم کا سپاٹ پن ہے، لیکن آخری جملے میں ایک طرح کا حُسن موجود ہے۔ پہلے چاروں جملوں میں براہِ راست بات بیان کی گئی ہے، مگر آخری جملے میں اظہار بالواسطہ ہے۔ جملے میں ابہام اور حسن بالواسطہ اظہار سے ہی پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا ادبی پیرایۂ بیان میں ابہام اور حسن ہوتا ہے، اس لیے کہ ادبی اظہار میں خیال اور جذبہ دونوں ہوتے ہیں، مگر صحافتی، دفتری، قانونی اور تکنیکی بیان میں صرف خیال اور معلومات ہوتی ہیں۔ خیال میں قطعیت جبکہ جذبے میں ایک قسم کی دُھند اور ابہام ہوتا ہے۔

سرگرمیاں:

۱۔ اساتذہ درست تلفظ اور ادائیگی کے ساتھ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی کوئی آسان اور معروف غزل طلبہ کو یاد کرائیں۔

۲۔ بچوں کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ کرایا جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کے لیے لازم ہے کہ یہ سبق پڑھانے سے پہلے مرزا غالبؔ اور مولانا حالیؔ کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے "یادگارِ غالبؔ" کا تعارف کرائیں۔

۲۔ مرزا غالبؔ کی علمی و ادبی حیثیت اُجاگر کریں۔

۳۔ سبق پڑھاتے ہوئے مرزا غالبؔ کے چند اشعار بھی طلبہ کو سنائے جائیں اور اُن کا مفہوم واضح کیا جائے۔

۴۔ اس سبق میں جن شاعروں اور ادیبوں کا ذکر آیا ہے، ان کا تعارف کرایا جائے۔

۵۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ غالبؔ کس طرح میرؔ کی عظمت کے قائل تھے نیز غالبؔ کا یہ شعر سنایا جائے:

ریختے کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

۶۔ نئے اور مشکل الفاظ کا مفہوم واضح کر کے ان کا استعمال طلبہ کو سکھایا جائے۔

سر سیّد احمد خان

(۱۸۱۷ء............۱۸۹۸ء)

سرسیّد کے مورثِ اعلیٰ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ مغلیہ دربار کے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ سرسیّد نے رواجِ زمانہ کے مطابق تعلیم پائی۔ سب سے پہلے عدالت میں بطور سررشتہ دار کام کیا، پھر ترقی کر کے منصف ہو گئے۔ سرکاری ملازمت کے باوجود سرسیّد مسلمانانِ ہند کی اصلاح کے لیے برابر کوشاں رہے۔ انھوں نے پہلے ایک انگریزی سکول مراد آباد اور غازی آباد میں کھولا۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں ہندی مسلمانوں کا سب سے اہم تعلیمی، سیاسی اور ادبی مرکز قرار پایا۔ انگریزی سے اُردو میں تراجم کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ ۱۸۷۰ء میں علمی و ادبی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس رسالے کی پروردہ نسل نے ہماری اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے۔

سرسیّد نے اردو میں مضمون کی صنف کو رواج دیا۔ خود کثرت سے مضامین لکھے اور اپنے رفقا سے قومی، تعلیمی، مذہبی، اخلاقی موضوعات پر مضامین لکھوائے۔ سرسیّد کا اسلوبِ نگارش، سادہ، سہل، بے ساختہ اور تصنع سے پاک ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا کہنا ہے:

> ''من جملہ بے شمار احسانات کے جو سرسیّد نے ہماری قوم پر کیے، ان کا بہت بڑا احسان اُردو زبان پر ہے۔ انھوں نے زبان کو پستی سے نکالا، اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ وسعت پیدا کی۔ سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا، جدید علوم کے ترجمے کرائے، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔''

سرسیّد ایک بڑے مصلح اور معمارِ قوم ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے چھوٹی بڑی تیس سے زائد کتابیں لکھیں۔ تقریریں، خطوط اور مضامین کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں ''آثار الصنادید''، ''رسالۂ اسبابِ بغاوتِ ہند''، ''تبین الکلام''، ''خطباتِ احمدیہ'' اور ''تفسیرِ قرآن'' شامل ہیں۔

کاہلی

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو لفظ ''کاہلی'' کے لفظی اور اصطلاحی معنی سے متعارف کرانا۔
۲۔ اُردو مضمون نویسی کے ابتدائی اسلوب سے آگاہ کرنا۔
۳۔ سرسیّد احمد خان کی تحریروں میں موجود مقصدیت سے روشناس کرانا۔
۴۔ اُمتِ مسلمہ کے زوال کے ایک اہم سبب سے آگاہ کرنا۔

یہ اک ایسا لفظ ہے، جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج محنت مزدوری میں چُستی نہ کرنا، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا، کاہلی ہے، مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت، اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا، ایک ایسی چیز ہے کہ بہ مجبوری اُس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں، بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا، گویا اُن کی طبیعتِ ثانی ہو جاتی ہے، مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے، وہ اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقّی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہو گا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے، لیکن اگر انسان اُن عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بے کار ڈال دے، تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی، مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اُس کے دِلی قویٰ کی تحریک سُست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی، تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے اور جسمانی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور انسانی صفت کو کھو کر پورا حیوان بن جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور اُن کو بے کار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو، جس کی آمدنی، اُس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اُس کے حاصل کرنے میں اُس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے، جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بے کار ڈال دے تو اُس کا حال کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اُس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ مزے دار کھانا اُس کو پسند ہوگا، قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا اور یہی سب باتیں اُس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں، البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوا ڑ، بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں، جن میں اُن کو قوائے دلی اور قوتِ عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں، وہاں کے لوگوں کے لیے ایسے موقعے بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اُس کا شوق نہ رہے، جیسا کہ اب ہے، تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے، مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوتِ عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے، اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے، یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوتِ عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے، تو ہم کو اس کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ موقع کیوں کر حاصل ہو۔ اگر اُس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے، تو اس کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیے، کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے، تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا، اُس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔

(مقالاتِ سرسیّد: حصّۂ پنجم)

مشق

ا۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دینے کا کیا مطلب ہے؟

(ب) انسان کب سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے؟

(ج) کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا کیوں لازم ہے؟

(د) قوم کی بہتری کیسے ممکن ہے؟

۲۔ سبق ''کاہلی'' کے متن کو مدِّ نظر رکھ کر درست جواب کی نشان دہی (✓) سے کریں۔

(الف) روٹی پیدا کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے:

(i) آرام (ii) محنت

(iii) سفارش (iv) خوشامد

(ب) لوگ بہت کم کاہل ہوتے ہیں:

(i) بے فکر رہنے والے (ii) خوش گپیاں کرنے والے

(iii) روزانہ محنت کرنے والے (iv) خود میں مگن رہنے والے

(ج) ہر ایک انسان پر لازم ہے:

(i) اپنے بارے میں سوچے (ii) مزے دار کھانے کھائے

(iii) حقے کے دھوئیں اڑائے (iv) اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھے

(د) قوم کی بہتری کی توقع کی جا سکتی ہے:

(i) کاہلی چھوڑ کر (ii) فکرمندی چھوڑ کر

(iii) خوش و خرم رہ کر (iv) پریشان رہ کر

۳۔ موزوں الفاظ سے خالی جگہیں پُر کریں۔

(الف) اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سُستی کرنا.................ہے۔

(نیند، کاہلی، بے کاری، بے عملی)

(ب) جب اس کے دلی قویٰ کی تحریک سُست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی.................میں پڑ جاتا ہے۔

(انسانی خصلت، حیوانی خصلت، حیوانی جبلت، انسانی کم زوری)

(ج) ہمارے ملک میں، جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوتِ عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے، اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے.................اختیار کی ہے۔

(کاہلی، بے راہ روی، قمار بازی، تماش بینی)

(د) کسی شخص کے دل کو.................پڑا رہنا نہ چاہیے۔

(مصروف، فکرمند، بے کار، غم زدہ)

۴۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

کاہلی، عقل، عارضی، وحشی، شک، مصروف

۵۔ درست بیان کے آگے (✓) اور غلط بیان کے آگے (×) کا نشان لگائیں:

(الف) دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

(ب) ہاتھ پاؤں کی محنت، اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے ضروری نہیں۔

(ج) یہ سچ نہیں ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں۔

(د) کاہلی ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔

۶۔ اِعراب لگا کر درست تلفّظ واضح کریں۔

کاہل، قویٰ، طبیعت، تحریک، رفع

۷۔ سر سیّد نے اس مضمون میں دو طرح کی کاہلی میں فرق کیا ہے: ایک وہ جو ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنے کا نام ہے اور دوسری وہ کاہلی ہے، جس میں انسان کے دِلی قویٰ بے کاری میں پڑ جاتے ہیں۔ سر سیّد دوسری کاہلی کو بُری کاہلی قرار دیتے ہیں۔ غور کر کے بتائیں کہ دلی قویٰ کی بے کاری کا کیا مطلب ہے اور انسان کیسے دلی قویٰ کی بے کاری کے بعد حیوان اور وحشی ہو جاتا ہے؟

۸۔ قوتِ عقلی وہ انسانی صلاحیت ہے، جو ہر شے، ہر مشکل، ہر مسئلے کو سمجھنے اور سُلجھانے کا قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ کسی ایسے مسئلے کی نشان دہی کریں، جسے آپ نے اپنی عقل کی مدد سے سُلجھایا ہو۔

مضمون:

مضمون کا لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے عربی ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں ضمن میں لیے ہوئے۔ کسی مقررہ موضوع پر اپنے خیالات، جذبات، تأثرات کا تحریری اظہار، مضمون کہلاتا ہے۔ دنیا کے ہر معاملے، مسئلے یا موضوع پر مضمون قلم بند کیا جا سکتا ہے۔ مضمون کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے، پھر اس کی حمایت یا مخالفت میں دلائل دیے جاتے ہیں، بحث کی جاتی ہے اور آخر میں اس بحث کا نتیجہ پیش کیا جاتا ہے۔ مضمون عام طور پر مختصر ہوتا ہے اور موضوع کے چیدہ چیدہ پہلوؤں پر دلچسپ پیرائے میں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ یوں تو مضمون کی کئی قسمیں ہیں: علمی، تاریخی، تنقیدی، سوانحی، فلسفیانہ، سائنسی، اصلاحی، ادبی۔ تاہم ادب میں ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی

اس تحریر کو مضمون کہا جاتا ہے، جس میں کہانی نہ ہو، خیالات، تأثرات اور جذبات ہوں۔

مضمون کی اس تعریف کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ''انٹرنیٹ کے فوائد اور نقصانات'' پر مضمون لکھیں۔

سرگرمیاں:

۱۔ کلاس کے بچوں کے درمیان محنت کے موضوع پر تقریری مقابلہ کرایا جائے۔

۲۔ بچوں سے کسی موضوع پر مضمون لکھوائیں اور اسے جماعت کے کمرے میں پڑھ کر سنایا جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ، طلبہ کو مضمون کی صنف سے متعارف کرائیں۔

۲۔ سرسیّد احمد خان کا تعارف اور ان کے اسلوب کی چیدہ چیدہ خصوصیات طلبہ کو بتائی جائیں۔

۳۔ طلبہ کو کوئی ایسا واقعہ یا کہانی سنائیں، جس سے وہ سُستی اور کاہلی سے متنفر ہوں۔

۴۔ طلبہ کو ادب اور مقصدیت کے باہمی تعلق اور تال میل سے آگاہ کریں۔

مولانا محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء..........۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزادؔ معروف عالمِ دین اور صحافی مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ دِلّی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد، آزادؔ کے والد انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ گھر بار لُٹ گیا۔ تلاشِ معاش میں دِلّی چھوڑی۔ لکھنؤ اور حیدرآباد گئے۔ پھر لاہور پہنچ کر محکمۂ تعلیم میں پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ حکومتِ پنجاب نے ان سے متعدد نصابی اور درسی کتابیں لکھوائیں۔ لاہور میں قائم انجمنِ پنجاب میں لیکچرر اور سیکرٹری رہے۔ آخری دنوں میں، گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ ۱۸۸۸ء میں دماغی مرض شروع ہوا، جو مرتے دم تک باقی رہا۔

آزادؔ اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ وہ اپنے اسلوبِ بیان کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کا تمثیلی اسلوبِ بیان انھیں اپنے عہد کے ادیبوں اور نثر نگاروں میں منفرد بناتا ہے۔ تخیل آفرینی، پیکر تراشی، تجسیم نگاری، شعریت اور رنگینی، واقعہ نگاری، نفسیاتی حقیقت آرائی اور مبالغہ آرائی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کا اندازِ بیان، نثر کا ایک ایسا خوب صورت اور دلکش شاہکار ہے، جس نے ان کے بعد آنے والے ادیبوں کی اکثریت کو متاثر کیا۔ خوب صورت اور دلنشیں نثر کے علاوہ، ان کا ایک بڑا کارنامہ، اُردو میں جدید طرزِ شاعری ہے، جس کی ابتدا انجمنِ پنجاب لاہور کے مشاعروں سے ہوئی، جس کے وہ سیکرٹری تھے۔

آزادؔ کی تصانیف میں ''آبِ حیات''، ''دربارِ اکبری''، ''نیرنگِ خیال''، ''قصصِ ہند'' اور ''سخندانِ فارس'' بہت مشہور ہیں۔ اپنے اُستاد، ابراہیم ذوقؔ کا دیوان بھی آزاد نے مرتب کیا۔ آزادؔ نے موضوعاتی نظمیں بھی لکھیں، جو ''نظمِ آزادؔ'' میں شامل ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد

شاعروں کے لطیفے

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتانا کہ ہمارے شاعروں کی حسِ مزاح کس قدر تیز ہوتی ہے اور اُن کی عام گفتگو میں کتنے لطیف پہلو موجود ہوتے ہیں۔
۲۔ شعر و ادب میں طنز و ظرافت کی اہمیت واضح کرنا۔
۳۔ آپس کے تعلقات میں رواداری، تحمل اور برداشت کی ضرورت کا احساس اُجاگر کرنا۔
۴۔ مختلف شاعروں کے اندازِ گفتگو اور طبیعتوں سے متعارف کرانا۔
۵۔ کچھ زبان زدِ عام اشعار کے موقع و محل اور استعمال سے روشناس کرانا۔

(۱)

ایک دن لکھنؤ میں میؔر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں نے تکرار میں طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ اُنھی کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ دونوں صاحبِ کمال ہیں، مگر فرق اتنا ہے کہ میؔر صاحب کا کلام 'آہ' ہے اور مرزا صاحب کا کلام 'واہ' ہے۔ مثال میں میؔر صاحب کا شعر پڑھا:

سرھانے میؔر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا:

سوؔدا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے "ابھی آنکھ لگی ہے"

اِن میں سے ایک شخص جو مرزا کے طرف دار تھے، وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میؔر صاحب کے شعر کو سُن کر مسکرائے اور کہا، "شعر تو میؔر کا ہے، مگر داد خواہی اُن کی دَوا کی معلوم ہوتی ہے۔"

(۲)

ایک دن سوؔدا مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی ۱۲۔۱۳ برس کی عمر تھی، اُس نے غزل پڑھی۔ مطلع تھا:

دِل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیِ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا "یہ مطلع کس نے پڑھا؟" لوگوں نے کہا، حضرت یہ صاحبزادہ ہے۔" سودا نے بھی بہت تعریف کی۔ بہت مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے! جوان ہوتے نظر نہیں آتے۔ خدا کی قدرت اُن ہی دنوں میں لڑکا جَل کر مر گیا۔

(۳)

ایک دن اِنشاؔاللہ خاں، جُرأتؔ کی ملاقات کو آئے۔ دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اُنھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جُرأتؔ نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے، چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ کیا ہے؟ جُرأتؔ نے کہا خوب مصرع ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا، تب تک نہ سناؤں گا، نہیں تو تم مصرع لگا کر اِسے بھی چھین لو گے۔ سید انشاؔ نے بہت اصرار کیا۔ آخر جرأتؔ نے پڑھ دیا:

اس زُلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی

سید انشاؔ نے فوراً کہا:

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی

جُرأتؔ ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اُٹھا کر مارنے کو دوڑے۔ دیر تک سیّد انشاؔ آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے۔

(۴)

ایک مشاعرے میں شیخ امام بخش ناسخؔ ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا، مگر خواجہ حیدر علی آتشؔ وغیرہ چند شعرا ابھی موجود تھے، یہ جا کر بیٹھے۔ تعظیمِ رسمی اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا؟ اُنھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا:

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی امام بخش تھا، اِس لیے تمام اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی۔

(۵)

ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے اور خواجہ صاحب [حیدر علی آتشؔ] اپنی آزاد مزاجی سے کہا کرتے تھے کہ میاں کہاں جاؤ گے؟ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو اور جو خدا دیتا ہے، اِس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور کہا کہ حضرت! رخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا: "خیر باشد کہاں؟" اُنھوں نے کہا: "کل بنارس کو روانہ ہوں گا۔" "کچھ فرمائش ہو تو فرما دیجیے۔" آپ ہنس کر بولے: "اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔" وہ حیران ہو کر بولے کہ حضرت! یہاں اور

وہاں کا خُدا اجدا ہے؟ خواجہ صاحب نے کہا: ''جب خدا وہاں یہاں ایک ہے تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو؟ جس طرح اُس سے وہاں جا کر مانگو گے اُسی طرح یہاں مانگو، جو وہاں دے گا یہاں بھی دے گا۔'' اِس بات نے اُن کے دل پر ایسا اثر کیا کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا اور خاطر جمعی سے بیٹھ گئے۔

(۶)

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد [ابراہیم ذوقؔ] بھی حاضر تھے۔ ایک مُرشدزادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی اور مرشدزادی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ اُنھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسنؔ اللہ خاں بھی موجود تھے، اُنھوں نے عرض کی: ''صاحبِ عالم! اِس قدر جلدی، یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا؟'' صاحبِ عالم کی زبان سے اس وقت نکلا کہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔'' اُستاد صاحب نے بے توقف عرض کی کہ حضور:

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

(۷)

مرزا [غالبؔ] کی قاطعِ برہان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا: ''بھائی! اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اُس کا کیا جواب دو گے؟''

(آبِ حیات)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

(الف) خواجہ باسط نے میر اور مرزا کے کلام کے بارے میں کیا فرمایا؟

(ب) شریف زادے کی غزل سن کر سوداؔ نے کیا کہا؟

(ج) سید انشا کے اصرار پر جرأت نے کون سا مصرع پڑھا؟

(د) خواجہ صاحب اپنے اُس شاگرد سے کیا کہا کرتے تھے، جو اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ کیا کرتے تھے؟

(ہ) صاحبِ عالم کی زبان سے اُس وقت کیا نکلا جب حکیم احسن اللہ خاں نے جلدی سے اُن کے آنے اور جانے پر اظہارِ تعجب کیا؟

۲۔ درست جملوں پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(الف) شعر تو میرؔ کا ہے مگر داد خواہی اُن کی دَ دَا کی معلوم ہوتی ہے۔

(ب) سوداؔ نے بہت تعریف کی اور کہا کہ میاں لڑکے بہت طویل عمر پاؤ گے۔

(ج) جراُتؔ ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اُٹھا کر مارنے کو دوڑے۔

(د) چونکہ نام بھی امام بخش تھا، اِس لیے تمام اہلِ جلسہ خاموش رہے۔

(ہ) بھائی! اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟

۳۔ سبق کے متن کو مدِنظر رکھ کر درست جواب کی نشان دہی (✓) سے کریں۔

(الف) میرؔ اور مرزا کے کلام پر تکرار کرنے والے کس کے مرید تھے؟

(i) خواجہ میر درد کے (ii) مرزا غالبؔ کے

(iii) ابراہیم ذوقؔ کے (iv) خواجہ باسط کے

(ب) انشااللہ خاں ایک دن کس کی ملاقات کو آئے؟

(i) غالبؔ کی (ii) میر دردؔ کی

(iii) جراُتؔ کی (iv) مصحفی کی

(ج) یہ مصرع ''اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی'' کس شاعر کا ہے؟

(i) انشاؔ کا (ii) جراُتؔ کا

(iii) دردؔ کا (iv) میرؔ کا

(د) ''قاطعِ برہان'' کے مصنّف کون ہیں؟

(i) ذوقؔ (ii) مومنؔ

(iii) غالبؔ (iv) سوداؔ

۴۔ متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) ایک دن لکھنؤ میں .... کے کلام پر دو شخصوں نے تکرار میں طول کھینچا۔

(ب) میر صاحب کا کلام .... ہے، مرزا صاحب کا کلام .... ہے۔

(ج) گرمیٔ کلام پر .... بھی چونک پڑے۔

(د) .... نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے۔

(ہ) جراُتؔ ہنس پڑے اور .... اٹھا کر مارنے کو دوڑے۔

(و) .... کو .... میں بہت دُور کی سُوجھی

(ز) چونکہ نام بھی............تھا اس لیے تمام اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی۔

(ح) ایک شاگرد اکثر............کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے۔

(ط) ایک دن معمولی دربار تھا............بھی حاضر تھے۔

(ی) انھوں نے............بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔

۵۔ ان الفاظ کے متضاد لکھیں۔

کمال، طرف دار، گرمی، مطلع، خاص، بے روزگاری

۶۔ مذکر اور مؤنث الفاظ الگ الگ کریں۔

کلام، تکرار، طول، آہ، قیامت، شور، چراغ، تعریف، قدرت، زلف، مصرع، مزاج، تسبیح، شکایت

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اِعراب لگائیں۔

کمال، مطلع، چراغ، اشتیاق، غنیمت

۸۔ مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح سیاق وسباق کے ساتھ کیجیے۔

''ایک دن معمولی دربار تھا............اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے۔''

۹۔ مندرجہ ذیل واحد الفاظ کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

کمال، شعر، مشاعرہ، بیگمات، شخص، خُدام

۱۰۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
آہ	ٹُک
پھپھولے	سوؔدا
ذرا	آتشؔ
مرزا	واہ
جرأتؔ	دل

ذُومعنی الفاظ:

کچھ الفاظ ذُومعنی ہوتے ہیں یعنی ایسے الفاظ جن کے دو مفہوم ہوں مثلاً:

الفاظ	تکرار	عرض	مطلع
معنی	ا۔ جھگڑا ۲۔ بار بار	ا۔ گزارش ۲۔ چوڑائی	ا۔ غزل اور قصیدے کا پہلا شعر ۲۔ طلوع ہونے کی جگہ

بچوں کو ایسے مزید پانچ الفاظ تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھنے کی تلقین کی جائے۔

سرگرمیاں:

ا۔ آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' سے ان لطیفوں کے علاوہ کوئی اور لطیفہ پڑھ کر اپنی کاپی پر لکھیں۔

۲۔ طلبہ کو پہلے میر تقی میر کی کوئی غزل درست تلفّظ کے ساتھ سنائیں اور پھر ان کو پڑھنے کے لیے کہا جائے۔

اشاراتِ تدریس

ا۔ اساتذہ کے لیے لازم ہے کہ اس سبق کی تدریس سے قبل وہ خود محمد حسین آزاد اور اُن کی کتاب ''آبِ حیات'' سے آگاہی حاصل کریں۔

۲۔ اس سبق کی تدریس سے قبل طلبہ کو ''لطائف'' کے اُسلوب سے آگاہ کریں۔

۳۔ ایک ایک لطیفے کی قرأت کے ساتھ ساتھ اُس کی وضاحت کریں اور جو اشعار ان میں استعمال ہوئے ہیں اُن کی تشریح کریں۔

۴۔ قرأت کے دوران لطیفے کا تاثر قائم رکھیں۔

۵۔ نئے الفاظ کا مفہوم بیان کریں اور اُن کا استعمال سمجھائیں۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

(۱۸۳۱ء.........۱۹۱۲ء)

نذیر احمد ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کرنے کے بعد دِلّی آ گئے، جہاں مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں دِلّی کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد عملی زندگی کا آغاز کنجاہ ضلع گجرات میں ایک سکول میں مدرّس کی حیثیت سے کیا۔ تھوڑے دنوں بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۱ء میں انڈین پینل کوڈ کے ترجمے کی وجہ سے پہلے تحصیل دار اور بعد میں افسرِ بندوبست بنے۔ سر سالارِ جنگ کے ایما پر انگریزی ملازمت چھوڑ کر حیدر آباد دکن کی ملازمت اختیار کی۔ ایک عرصے تک وہاں خدمت انجام دینے کے بعد ملازمت چھوڑ کر دلّی آ گئے اور بقیہ زندگی یہیں گزاری۔

آپ کے ناول اصلاحی انداز کے حامل ہیں کیونکہ ان سے انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا کام لیا۔ اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد کی مقصد پسندی نے ناول کے فن کو کسی حد تک متاثر کیا ہے لیکن یہ مقصدیت، ان کے اسلوبِ بیان کی لطافت اور چاشنی کو ختم نہیں کرتی۔ ان کی زبان علمی بھی ہے اور عوامی بھی۔ معاشرتی لطافتوں کے آئینہ دار محاوروں کے استعمال کا انھیں ملکہ حاصل ہے۔ بالخصوص عورتوں کی مخصوص زبان، محاوروں اور مکالموں کے وہ اُستاد تسلیم کیے گئے ہیں۔

نذیر احمد دہلوی کا شمار اُردو کے ارکانِ خمسہ میں ہوتا ہے۔ آپ اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ آپ کے ناولوں میں ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح''، ''فسانۂ مبتلا'' اور ''ابن الوقت'' زیادہ اہم ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

نصوح اور سلیم کی گفتگو

مقاصد تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو ناول کی ابتدائی صورت سے متعارف کرانا۔
۲۔ طلبہ کو آدابِ معاشرت سے آگاہ کرنا۔
۳۔ طلبہ کو زبان کی سلاست اور محاورات کے استعمال سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ کو بتانا کہ ایک اچھا طالب علم کیسے بنا جا سکتا ہے۔

تعارف:

(دِلّی میں ایک سال ہیضے کی سخت وبا آئی۔ نصوح بھی دیگر افراد کی طرح ہیضے میں مبتلا ہوا اور سمجھا کہ موت قریب ہے۔ مایوسی کے عالم میں اُسے عاقبت کی فکر ہوئی۔ ڈاکٹر نے اُسے خواب آور دوا دی تو وہ سو گیا۔ خواب میں اُس نے مرنے کے بعد عاقبت کے دل دہلا دینے والے مناظر دیکھے، تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ خواب سے بیدار ہو کر نصوح کو اپنی اور اپنے خاندان کی بے مقصد زندگی پر افسوس ہوا۔ اس نے گزشتہ زندگی کی تلافی کا عہد کر کے، اپنی بیوی فہمیدہ کو خاندان کی اصلاح کے لیے اپنا مددگار بنایا۔ اِسی سلسلے میں ایک روز اپنے بیٹے سلیم کو بالا خانے پر صبح کے وقت بیدارا کے ذریعے بُلا بھیجا۔)

آج تو میاں بیوی میں یہ قول قرار ہوا۔ اگلے دن چھوٹا بیٹا سلیم ابھی سو کر نہیں اٹھا تھا کہ بیدارا نے آجگایا کہ صاحب زادے اُٹھیے، بالا خانے پر میاں بُلاتے ہیں۔ سلیم کی عمر اس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سُنی، گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے ہاتھ مُنھ دھو، ماں سے آکر پوچھنے لگا: ''امّاں جان! تم کو معلوم ہے ابّا جان نے کیوں بُلایا ہے؟''

ماں: ''مجھ کو کچھ خبر نہیں۔''

سلیم: ''کچھ خفا تو نہیں ہیں؟''

ماں: ''ابھی تو کوٹھے پر سے نہیں اُترے۔''

سلیم: ''بیدارا! تجھ کو کچھ معلوم ہے؟''

بیدارا: ''میاں! میں اُوپر لوٹا لینے گئی تھی۔ میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا کہ اُن کو بھیج دیجیو۔''

سلیم: ''صورت سے کچھ غصّہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا؟''

بیدارا: ’’نہیں تو۔‘‘

سلیم: ’’تو امّاں جان! ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔‘‘

ماں: ’’میری گود میں لڑکی سوتی ہے۔ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو، جاتے کیوں نہیں؟‘‘

سلیم: ’’کچھ پوچھیں گے؟‘‘

ماں: ’’جو کچھ بھی پوچھیں گے تم اُس کا معقول طور پر جواب دینا۔‘‘

غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اُوپر گیا اور سلام کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ باپ نے پیار سے بُلا کر پاس بٹھا لیا اور پوچھا:

باپ: ’’کیوں صاحب! آج مدرسے نہیں گئے؟‘‘

بیٹا: ’’جی، بس جاتا ہوں۔ ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اور ہے۔‘‘

باپ: تم اپنے بھائی جان کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ؟‘‘

بیٹا: ’’کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں، ورنہ اکیلا جاتا ہوں۔‘‘

باپ: ’’کیوں؟‘‘

بیٹا: ’’اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے۔ چھوٹے بھائی جان اسی کے واسطے تیاری کر رہے ہیں۔ صبح سویرے اُٹھ کر کِسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ وہاں ان کو دیر ہو جاتی ہے، تو پھر گھر بھی نہیں آتے۔ میں جاتا ہوں تو اُن کو مدرسے میں پاتا ہوں۔‘‘

باپ: ’’کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے کہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں؟‘‘

بیٹا: ’’جگہ تو ہے، مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہوا کرتا ہے؛ اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا۔‘‘

باپ: ’’تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو؟‘‘

بیٹا: ’’مہرے پہچانتا ہوں، چالیں جانتا ہوں، مگر کبھی خود کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔‘‘

باپ: ’’مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے۔‘‘

بیٹا: ’’شاید مجھ کو عمر بھر بھی شطرنج کھیلنی نہ آئے گی۔‘‘

باپ: ’’کیوں، کیا ایسی مشکل ہے؟‘‘

بیٹا: ’’مشکل ہو یا نہ ہو، میرا جی ہی نہیں لگتا۔‘‘

باپ: ’’سبب؟‘‘

بیٹا: ’’میں پسند نہیں کرتا۔‘‘

باپ: ”چونکہ مشکل ہے، اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمھاری طبیعت خُوب لگتی ہوگی۔ وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے۔“

بیٹا: ”ہاں شطرنج کی نسبت کر[1] گنجفہ کو زیادہ ناپسند کرتا ہوں۔“

باپ: ”ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظے پر۔“

بیٹا: ”میری ناپسندیدگی کا کچھ خاص کر یہی سبب نہیں ہے، بلکہ مجھ کو سارے کھیل بُرے معلوم ہوتے ہیں۔“

باپ: ”تمھاری اس بات سے مجھ کو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب سُننا چاہتا ہوں، کیوں کہ شاید اب سے پانچ یا چھے مہینے پہلے، جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا، میں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا۔“

بیٹا: ”آپ درست فرماتے ہیں۔ میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا مگر اب تو مجھ کو ایک دِلی نفرت ہوگئی ہے۔“

باپ: ”آخر اس کا کوئی سبب خاص ہوگا۔“

بیٹا: ”آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے، گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔“

باپ: ”وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بھڈّی جوتیاں پہنے، منڈے ہوئے سر، اونچے پاجامے، نیچی چولیاں۔“

بیٹا: ”ہاں جناب وہی چار لڑکے۔“

باپ: ”پھر؟“

بیٹا: ”بھلا آپ نے کبھی ان کو کسی قسم کی شرارت کرتے بھی دیکھا ہے؟“

باپ: ”کبھی نہیں۔“

بیٹا: ”جناب کچھ عجب عادت ان لڑکوں کی ہے۔ راہ چلتے ہیں، تو گردن نیچی کیے ہوئے۔ اپنے سے بڑا مل جائے، جان پہچان ہو یا نہ ہو، ان کو سلام کر لینا ضرور۔ کئی برس سے اس محلّے میں رہتے ہیں، مگر کانوں کان خبر نہیں۔ محلّے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں، لیکن ان کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپس میں اُوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں۔ نہ کبھی لڑتے، نہ کبھی جھگڑتے، نہ گالی بکتے، نہ قسم کھاتے، نہ جھوٹ بولتے۔ نہ کسی کو چھیڑتے، نہ کسی پر آوازہ کستے۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں، وہاں بھی ان کا یہی حال ہے۔ کبھی کسی نے ان کی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی

---

[1] آگرہ اور کان پور دونوں ابتدائی ایڈیشنوں میں ”نسبت کر“، لکھا ہوا ہے۔ بہ نسبت کی جگہ یہ متروک ترکیب نذیر احمد کے یہاں بھی کم دیکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں صرف دو جگہ آئی ہے۔

ہوا کرتی ہے۔لڑکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔"

باپ: "بھلا پھر؟"

بیٹا: "منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے۔ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا۔مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا کہ کم بخت گھر سے گھر مِلا ہے۔اسی کے پاس جا کر یاد کر لیا کر۔میں نے جو پوچھا: 'کیوں صاحب یاد کرا دیا کرو گے؟' تو کہا: 'بہ سروچشم۔' غرض میں اگلے دن ان کے گھر گیا، آواز دی۔انھوں نے مجھ کو اندر بُلا لیا۔ دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جائے نماز بچھائے قبلہ رُو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں۔ وہ ان لڑکوں کی نانی ہیں۔لوگ ان کو 'حضرت بی' کہتے ہیں۔ میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے پاس جا بیٹھا۔ جب 'حضرت بی' اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا! گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دُعا دوں۔ جیتے رہو، عمر دراز، خدا نیک ہدایت دے۔اُن کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اُٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔تب 'حضرت بی' نے فرمایا: بیٹا! بُرا مت ماننا، یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے، اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں اور میں تم کو نہ ٹوکتی لیکن چونکہ تم میرے بچوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو، اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا۔اس کے بعد حضرت بی نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی۔ مدتوں میں ان کے گھر جاتا رہا۔حضرت بی بھی مجھ کو اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں اور مجھ کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں۔تبھی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹّا ہو گیا۔"

(توبۃ النصوح)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) بیدارا نے سلیم کو جگا کر کیا پیغام دیا؟

(ب) سلیم کی ماں نے سلیم کے ساتھ نصوح کے پاس جانے سے کیوں انکار کیا؟

(ج) سلیم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے کیوں نہیں جاتا تھا؟

(د) سلیم نے چار لڑکوں کی کیا خوبیاں بیان کیں؟

(ہ) حضرت بی کون تھیں اور اُنھوں نے سلیم کو کیا نصیحت کی؟

۲۔ مندرجہ ذیل محاورات کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

جی لگنا، کانوں کان خبر نہ ہونا، آوازہ کسنا، زمین میں گڑ جانا، دل کھٹّا ہونا

۳۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیں۔

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع لکھیں۔

خبر، کتاب، مدرسہ، امتحان، مشکل

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا تلفظ اِعراب کی مدد سے واضح کریں۔

صورت، تعجب، مسجد، عمر دراز، بسر و چشم

۶۔ مصنّف کا نام، سبق کا عنوان اور اقتباس کا نصابی سبق میں موقع و محل درج کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح کریں۔

کئی برس سے اس محلّے.................................جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔

۷۔ متن کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) سلیم کی عمر اس وقت کچھ کم .... کی تھی۔

(ب) میں اوپر .... لینے گئی تھی۔

(ج) صورت سے .... تو نہیں معلوم ہوتا تھا۔

(د) سلیم ڈرتا ڈرتا .... گیا اور .... کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔

(ہ) اگلے مہینے .... ہونے والا ہے۔

(و) شاید مجھ کو عمر بھر بھی .... کھیلنی نہ آئے گی۔

(ز) بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت .... ہوا کرتا ہے۔

۸۔ متن کو مدِّ نظر رکھ کر درست جواب کی (✓) سے نشان دہی کریں۔

(الف) سلیم کو کس نے آ کر جگایا؟

(i) نصوح نے (ii) بیدارا نے

(iii) ماں نے (iv) حضرت بی نے

(ب) میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کیا کر رہے تھے؟

(i) شطرنج کھیل رہے تھے۔ (ii) کھانا کھا رہے تھے۔

(iii) کتاب پڑھ رہے تھے۔ (iv) لکھ رہے تھے۔

(ج) ماں کی گود میں کون سویا ہوا تھا؟

(i) بلّی (ii) سلیم

(iii) لڑکی (iv) بیدارا

(د) سلیم ڈرتا ڈرتا کہاں گیا؟

(i) مدرسے (ii) بازار

(iii) مسجد (iv) اوپر

(ہ) اکثر کون گھبرایا کرتا ہے؟

(i) مبتدی (ii) چور

(iii) جھوٹا (iv) نالائق

(و) کھیل کے پیچھے کون دیوانہ بنا رہتا تھا؟

(i) نصوح (ii) سلیم

(iii) بیدارا (iv) منجھلا لڑکا

ناول:

ناول وہ کہانی ہے، جس کی بنیاد حقیقی زندگی پر ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کا کوئی ایک دور اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ دور اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ کہانی کے واقعات کے بہاؤ میں ایک فطری پن ہوتا ہے۔ اس کے کردار گوشت پوست

کے انسان ہوتے ہیں، جن میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ کرداروں کے مکالموں کی زبان، اُن کے مرتبے اور مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔

سرگرمیاں:

ا۔ مختلف بچوں کو سبق میں آنے والے کردار قرار دے کر، جماعت کے کمرے میں یہ سبق مکالماتی انداز میں بلند آواز میں پڑھا جائے۔

۲۔ بچوں سے ''نیک صحبت'' کے موضوع پر مکالمہ لکھوایا جائے۔

اشاراتِ تدریس

ا۔ اساتذہ طلبہ کو قصّے اور کہانی کے بارے میں اختصار سے بتائیں۔

۲۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے اصلاحی مقاصد کو طلبہ پر واضح کریں۔

۳۔ اس سبق میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں، اُن کو جملوں میں استعمال کر کے دکھائیں۔

۴۔ ڈپٹی نذیر احمد کی دیگر تصانیف کا مختصر تعارف کرائیں۔

منشی پریم چند

(۱۸۸۰ء............۱۹۳۶ء)

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ضلع بنارس کے ایک گاؤں ملہی میں پیدا ہوئے۔ والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ مڈل سکول سے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا اور مکمل طور پر علمی و ادبی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور اسی سال بنارس میں وفات پائی۔

پریم چند نے اپنی تحریروں میں ہندوستان کے دیہات میں بسنے والے مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کامیابی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں نیکی تمام تر مشکلات کے باوجود بدی کے مقابلے میں غالب رہتی ہے۔ ان کی زبان سادہ ہے۔ انھوں نے مقامی واقعات اور حقائق کو موضوع بنا کر تحریروں میں مقامی رنگ بھی پیدا کیا ہے۔ ان کی تحریروں کی بنیاد معاشرتی مسائل، نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ پر ہے۔ ان کے کردار زیادہ تر مثالی ہیں، جن میں تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قریباً ہر عمر اور پیشے سے متعلق کردار پیش کیے ہیں۔

پریم چند کا شمار اُردو کے اوّلین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں: ''سوزِ وطن''، ''پریم پچیسی''، ''پریم چالیسی''، ''زادِ راہ'' اور ''واردات'' زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے، جس میں: ''میدانِ عمل''، ''بازارِ حسن'' اور ''گئودان'' کو زیادہ شہرت ملی۔

پنچایت

مقاصد تدریس

۱۔ طلبہ کو پنچایت کے مفہوم اور اہمیت سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو عدل و انصاف اور حق و صداقت کی فضیلت سے روشناس کرانا۔

۳۔ دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے طلبہ کو متعارف کرانا۔

۴۔ یہ بتانا کہ صنفِ افسانہ کس طرح زندگی کی حقیقتوں سے وابستہ ہے۔

جُمّن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی، لین دین میں بھی کچھ ساجھا تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد تھا۔ جمن جب حج کرنے گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے اور الگو جب باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے۔ اس دوستی کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا، جب دونوں لڑکے جمن کے پدرِ بزرگوار شیخ جمراتی کے روبرو زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ الگو نے استاد کی بہت خدمت کی؛ خوب رکابیاں مانجھیں؛ خوب پیالے دھوئے۔ ان کا حُقّہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان کے باپ پُرانی وضع کے آدمی تھے۔ تعلیم کے مقابلے میں انھیں استاد کی خدمت پر زیادہ بھروسا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: استاد کی دعا چاہیے، جو کچھ ہوتا ہے، فیض سے ہوتا ہے اور اگر الگو پر استاد کے فیض یا دعاؤں کا اثر نہ ہوا تو اسے تسکین تھی کہ تحصیلِ علم کا کوئی دقیقہ اس نے فروگزاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر ہی میں نہ تھا۔ شیخ جمراتی خود دعا اور فیض کے مقابلے میں تازیانے کے زیادہ قائل تھے اور جمّن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمن کی قرب و جوار کے مواضعات میں پرسش ہوتی تھی۔ شیخ جمن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں۔ ان کے پاس کچھ تھوڑی سی ملکیت تھی مگر غریب کا وارث کوئی نہ تھا۔ جمن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرالی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ پر رجسٹری نہ ہوئی تھی، خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوتی تھیں۔ خوب میٹھے لقمے، چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے مگر پگڑی کی مہر ہوتے ہی اس کی خاطر داریوں پر بھی مہر ہوگئی۔ جمن کی اہلیہ بی فہمین نے رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے کم کر دی۔ کچھ دنوں تک خالہ جان نے اور دیکھا، مگر جب برداشت نہ ہوئی، تو جمن سے شکایت کی۔ جمن صلح پسند آدمی تھا۔ اب اس معاملے میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دن تو رو دھو کر کام چلا۔ آخر ایک روز خالہ جان نے جمن سے کہا:

''بیٹا! تمھارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو، میں اپنا الگ پکا لوں گی۔''

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا: ''روپیا کیا یہاں پھلتا ہے؟''

خالہ جان نے بگڑ کر کہا: ''تو مجھے نان نمک چاہیے یا نہیں؟''

جمن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا: ''چاہیے کیوں نہیں میرا خون چوس لو، کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھتا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کر آئی ہو۔''

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سُن سکتی تھیں۔ جامے سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمن ہنسے۔ وہ فاتحانہ ہنسی، جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ ہاں ہاں! ضرور پنچایت کرو، فیصلہ ہو جائے، مجھے بھی دن رات کا وبال پسند نہیں۔

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اُٹھے گی؟ اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب و جوار میں ایسا کون تھا، جو ان کا شرمندۂ منّت نہ ہو؟ کون تھا جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے؟ کس میں اتنی جرأت تھی جو ان کے سامنے کھڑا ہو سکے؟ آسمان کے فرشتے تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں۔

اس کے بعد کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لیے، آس پاس کے گاؤں کے چکّر لگاتی رہیں۔ کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا، مگر بات آ پڑی تھی، اس کا تصفیہ ضروری تھا۔ شیخ جمن کو اپنی طاقت، رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ وزاری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، خوبیٔ تقدیر کوئی اس طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں ہوں کر کے ٹال دیا؛ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ چاروں طرف سے گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔ لاٹھی پٹک دی اور دَم لے کر کہا:

''بیٹا! تم بھی گھڑی بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا۔''

الگو بے رُخی سے بولے: ''مجھے بلا کر کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں گے ہی۔''

خالہ نے ہانپ کر کہا: ''اپنی پھریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں، آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے۔''

الگو نے جواب دیا: ''یوں آنے کو میں بھی آ جاؤں گا، مگر پنچایت میں منھ نہ کھولوں گا۔''

خالہ نے حیرت سے پوچھا: ''کیوں بیٹا!''

الگو نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا: ''اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت، جمن میرے پرانے دوست ہیں، اس سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔''

خالہ نے تاک کر نشانہ مارا: ''بیٹا! کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟''

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی۔ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ حُقّہ پانی کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ جمن کی مہمان نوازی تھی۔ وہ خود الگو چودھری کے ساتھ دُور بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے۔ جب پنچایت پوری بیٹھ گئی، تو بوڑھی بی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:

''پنچو! آج تین سال ہوئے، میں نے اپنی سب جائیداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھ دی تھی، اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمن نے مجھے تاحینِ حیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے ان کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بے کس بیوہ ہوں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی، سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم لوگ جو راہ نکال دو، اس راہ پر چلوں، اگر میری بُرائی دیکھو، میرے مُنھ پر تھپڑ مارو، جمن کی بُرائی دیکھو، تو اسے سمجھاؤ۔ کیوں ایک بے کس کی آہ لیتا ہے؟''

رام دھن مصر بولے: ''جمن میاں پنچ کسے بدتے ہو؟ ابھی سے طے کر لو۔''

جمن نے حاضرین پر ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ دلیرانہ انداز سے کہا:

''خالہ جان جسے چاہیں، پنچ بنائیں، مجھے عذر نہیں ہے۔''

خالہ نے چلا کر کہا: ''ارے! اللہ کے بندے، تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا؟''

جمن نے بڑھیا کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا:

''اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ، جسے چاہو، پنچ بنا دو۔''

خالہ نے جمن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں: ''بیٹا! خدا سے ڈر۔ میرے لیے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا، اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہیں؟ اور سب کو جانے دو، الگو چودھری کو تو مانے گا؟''

جمن فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے، مگر ضبط کر کے بولے:

''الگو چودھری ہی سہی، میرے لیے جیسے رام دھن مصر، ویسے الگو، کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔''

الگو بغلیں جھانکنے لگے۔ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ معترضانہ انداز سے کہا:

''بوڑھی ماں! تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے۔''

خالہ نے جواب دیا:

''بیٹا دوستی کے لیے کوئی اپنا ایمان نہیں بیچتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے مُنھ سے جو بات نکلتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے۔''

الگو چودھری نے کہا:

''شیخ جمن! ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔ جب ضرورت پڑی ہے، تم نے میری مدد کی ہے اور ہم سے بھی جو بَن پڑا ہے، تمھاری خدمت کرتے آئے ہیں مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو اور نہ ہم تمھارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا۔ تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو، کہو۔''

جمن ایک شانِ فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: ''پنچو! میں خالہ جان کو اپنی ماں کی بجائے سمجھتا ہوں اور ان کی

خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں! عورتوں میں ذرا ان بن رہتی ہے، اس میں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے مگر ماہوار روپیا دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔''

الگو کو آئے دن عدالت سے واسطہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے۔ جمن سے جرح کرنے لگے۔ ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ جمن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے، اچھی دوستی نباہی۔

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا۔ لہجہ نہایت سنگین اور تحکمانہ تھا: ''شیخ جمن! پنچوں نے اس معاملے پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمھاری ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ خالہ جان کے ماہوار گزارے کا بندوبست کر دو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں اگر تمھیں یہ منظور نہیں، تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔''

جمن نے فیصلہ سنا اور سنّاٹے میں آ گیا۔ احباب سے کہنے لگا:

''بھئی! اس زمانے میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسا کرے، اس کی گردن پر چُھری پھیری جائے۔''

اس فیصلے نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درختِ حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے مگر وہ تیر و سپر کی طرح۔ جمن کے دل سے دوست کی غدّاری کا خیال دور نہ ہوتا تھا اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔ خوش قسمتی سے موقع بھی جلد مل گیا۔ الگو چودھری پچھلے سال میلے سے بیلوں کی ایک اچھی گوئیاں مال لائے تھے۔ پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے، مہینوں تک قرب و جوار سے لوگ انھیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچایت کے ایک مہینا بعد ایک بیل مر گیا۔ جمن نے اپنے دوستوں سے کہا: ''یہ دغا بازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کر جائے، مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔ الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمن نے اسے زہر دلوایا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائن کا خیال تھا کہ اس پر کچھ کرایا گیا ہے۔ چودھرائن اور فہمین میں ایک دن زور و شور سے ٹھنی؛ دونوں خواتین نے روانیِ بیان کی ندی بہادی؛ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمن نے آگ بجھا دی۔ بیوی کو ڈانٹا اور رزم گاہ سے ہٹا لے گیا۔ اِدھر الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں بیانی کی داد دی۔

ایک بیل کس کام کا۔ اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا۔ ناچار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سمجھو سیٹھ تھے، وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں میں گڑ، گھی بھرتے اور منڈی لے جاتے۔ منڈی سے تیل نمک لاد کر لاتے اور گاؤں میں بیچتے تھے۔ اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی، سوچا: اسے لے لوں، دام کے لیے ایک مہینے کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے، گھاٹے کی کچھ پروا نہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا، تو پاؤں پھیلائے، دن میں تین تین چار چار کھیوے کرتے۔ نہ چارے کی فکر تھی، نہ پانی کی، بس کھیوؤں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے، وہاں کچھ سوکھا بُھس ڈال دیا اور غریب جانور ابھی دَم بھی نہ لینے پاتا تھا کہ پھر جوت دیا۔

مہینے بھر میں بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ یکے کا جُوا دیکھتے ہی بے چارے کا ہاؤ چھوٹ جاتا؛ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا؛ ہڈیاں نکل آئی تھیں، لیکن اصیل جانور، مار کی تاب نہ تھی۔ ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا، دن بھر کا تھکا جانور، پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لے، ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر، کئی کوڑے بے دردی سے لگائے۔ بیل نے ایک بار پھر زور لگایا، مگر طاقت نے جواب دے دیا۔ زمین پر گر پڑا اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ کئی بورے گڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دو چار سو روپے کمر میں بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے، چھوڑ کر جا بھی نہ سکتے تھے۔ گاڑی پر لیٹ گئے، وہیں رت جگا کرنے کی ٹھان لی اور آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے۔ حقّہ پیا، گایا، پھر حقّہ پیا، آگ جلائی، تاپا۔ اپنی دانست میں تو وہ جاگتے ہی رہے، مگر جب پوہ پھٹی چونکے اور کمر پر ہاتھ رکھا، تو تھیلی ندارد۔ کلیجہ سن سے ہو گیا، کمر ٹٹولی، تھیلی کا پتا نہ تھا۔ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا، کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا، پچھاڑیں کھانے لگے۔ صبح کو بہ ہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے جب یہ الم ناک حادثہ سنا، تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے تو خوب روئیں، تب الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظِ ماتقدّم کی سُوجھی: نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعے کو کئی ماہ گزر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگتے، تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلائے ہوئے کُتّوں کی طرح چڑھ بیٹھتے۔ یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ فقیر ہو گئے۔ انھیں دام کی پڑی ہے۔ مردہ منحوس بیل دیا تھا، اس پر دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دھول جھونک دی۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ صبر نہ ہوتا ہو، تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے، دو مہینے جوت لو اور کیا لو گے؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدر دان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سُن کر چودھری لوٹ آتے، مگر ڈیڑھ سو روپے سے اس طرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔

ایک بار وہ بھی بگڑے، سیٹھ جی گرم ہو پڑے۔ سیٹھانی جی جذبے کے مارے گھر سے نکل پڑیں؛ سوال و جواب ہونے لگے؛ خوب مباحثہ ہوا، مجادلے کی نوبت آ پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھُس کر کواڑ بند کر لیے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہو گئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ سمجھو کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا اور صلاح دی کہ آپس میں سر پھٹول سے کام نہ چلے گا۔ اس سے کیا فائدہ، پنچایت کر لو جو کچھ طے ہو جائے اسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے، الگو نے بھی ہامی بھر لی۔ فیصلہ ہو گیا۔ پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

رام دھن مصر نے کہا:

''اب کیوں دیر کی جائے بولو چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟''

الگو نے منکسرانہ انداز میں جواب دیا:

"سمجھو سیٹھ ہی چُن لیں۔"

سمجھو سیٹھ کھڑے ہو گئے اور کڑک کر بولے:

"میرے طرف سے شیخ جمن کا نام رکھ لو۔"

الگو نے پہلا نام جمّن کا سنا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا، گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہ پر پہنچ گئے بولے: "چودھری تم کو، کوئی عذر تو نہیں ہے؟"

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا "نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔"

اس کے بعد چار نام تجویز کیے گئے۔ الگو پہلا چرکا کھا کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا۔ صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا۔ الگو اس فکر میں تھے کہ اس مرحلے کو کیوں کر طے کروں کہ یکا یک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گوڈر شاہ بولے:

"سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟"

سمجھو کھڑے ہو گئے اور اکڑ کر بولے: "شیخ جمن کو۔"

رام دھن مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا: "الگو تمھیں کوئی عذر ہو تو بولو۔"

الگو نے قسمت ٹھونک لی، حسرت ناک لہجے میں بولے! "نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔"

شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمے داری کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا، میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکمِ خدا ہے اور خدا کے حکم میں میری نیّت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے۔ حق اور راستی سے جَو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین ہی میں سیاہ بنا دے گا۔

پنچایت شروع ہوئی، فریقین نے اپنے حالات بیان کیے، جرح ہوئی، شہادتیں گزریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی۔ جمن نے بہت غور سے سنا اور تب فیصلہ سنایا۔

"الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ، پنچوں نے تمھارے معاملے پر غور کیا ہے۔ سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے۔ جس وقت بیل ان کے گھر آیا، اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو اسے واپس لینے کا ہر گز تقاضا نہ کرتے۔"

رام دھن مصر نے کہا: "قیمت کے علاوہ ان سے تاوان بھی لیا جائے، سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالا۔"

جمن نے کہا: "اس کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" گوڈر شاہ نے کہا سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیے۔ ان کا بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔

جمن بولا "اس کا بھی اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے۔" یہ فیصلہ سنتے ہی

الگو چودھری پھُولے نہ سمائے۔

ایک گھنٹے کے بعد جمن، شیخ الگو کے پاس آئے اوران کے گلے لپٹ کے بولے: ''بھیّا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے، میں دل سے تمھارا دشمن تھا مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ دشمن۔ انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا۔

الگو رونے لگے، دل صاف ہو گئے، دوستی کا مُرجھایا ہوا درخت پھر سے ہرا ہو گیا۔ اب وہ چالوں کی زمین پر نہیں، حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

مشق

ا۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) جمن شیخ اور الگو چودھری میں دوستی کا آغاز کب ہوا؟

(ب) شیخ جمن کی بیوی کا خالہ کی ملکیت کے ہبہ نامے کی رجسٹری کے بعد خالہ سے کیسا سلوک تھا؟

(ج) الگو چودھری کے پنچ مقرر ہونے پر شیخ جمن کیوں خوش تھا؟

(د) الگو چودھری نے کیا فیصلہ سنایا؟

(ہ) الگو چودھری کا فیصلہ سُن کر شیخ جمن کا ردِّ عمل کیا تھا؟

(و) الگو چودھری نے سمجھو سیٹھ کو بیل کیوں فروخت کیا؟

(ز) سمجھو سیٹھ نے الگو چودھری سے خریدے ہوئے بیل کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

(ح) الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ نے کون سا تنازع پنچایت کے سامنے پیش کیا؟

(ط) شیخ جمن نے فیصلہ سُناتے ہوئے انصاف کے اصولوں کو کہاں تک پورا کیا؟

۲۔ سبق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) جمن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا.................تھا۔

(ب) جمن جب حج کرنے گئے تھے تو.................الگو کو سونپ گئے تھے۔

(ج) ان کے باپ.................کے آدمی تھے۔

(د) شیخ جمعراتی خود دعا اور فیض کے مقابلے میں.................کے زیادہ قائل تھے۔

(ر) جمن نے وعدے وعید کے.................دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرا لی تھی۔

(ہ) خالہ جان اپنے.................کی بات نہیں سُن سکتی تھیں۔

(و) بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو.................. کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

(ز) شیخ جمن کو بھی اپنی.................. ذمّے داری کا احساس ہوا۔

(ح) دوستی کا.................. درخت پھر سے ہرا ہو گیا۔

۳۔ سبق کو مدِّنظر رکھ کر، درست بیان کے آگے (✓) اور غلط بیان کے آگے (×) کا نشان لگائیں۔

(الف) الگو جب کبھی باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ جاتے۔

(ب) الگو کے باپ نئے انداز کے آدمی تھے۔

(ج) الگو کی ایک بوڑھی، بیوہ خالہ تھیں۔

(د) کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لیے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہیں۔

(ہ) جمن نے بڑھیا کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

(و) شیخ جمن اپنی خالہ کو ماں کے برابر سمجھتے تھے۔

(ز) الگو قانونی آدمی نہیں تھے۔

(ح) ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتھوڑے کی طرح لگتا تھا۔

(ط) پنچایت کے ایک ہفتے بعد ایک بیل مر گیا۔

(ی) سمجھو سیٹھ منڈی سے تیل نمک لاد کر لاتے اور گاؤں میں بیچتے تھے۔

(س) رام دھن نے پہلا نام جمن کا سنا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔

(ص) شیخ جمن کو پنچ بن کر اپنی ذمّے داری کا احساس نہ ہوا۔

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے۔

ساجھا، زانوئے ادب تہ کرنا، وضع، رفتہ رفتہ، صلح پسند، تاحینِ حیات، پنچ

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی مؤنث لکھیں۔

اُستاد، شیخ، چودھری، سیٹھ، بیل

۶۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

زانوئے ادب، وضع، تحصیل علم، فروگزاشت، پرسش، تصفیہ، رسوخ، منطق، تحکمانہ، مباحثہ

۷۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیں۔

۸۔ عبارت کی تشریح کریں۔ سبق کا عنوان اور مصنّف کا نام بھی لکھیں۔

"بھیّا! جب سے تم نے.................. حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔"

۹۔ ذیل میں مختلف محاوروں کو دو دو جملوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ درست استعمال کے آگے (✓) اور غلط بیان کے آگے (×) کا نشان لگائیں:

(i) سبز باغ دکھانا: (الف) اکرم نے مجھے ملتان میں اپنے سبز باغ دکھائے۔
(ب) سیاسی لوگ سبز باغ دکھا کر عوام کو لوٹتے ہیں۔

(ii) زخم پر نمک چھڑکنا: (الف) سعد نے میرے بازو کے زخم پر نمک چھڑکا تو میری چیخیں نکل گئیں۔
(ب) آپ میرے زخم پر نمک چھڑکنے کے بجائے میری مدد کریں۔

(iii) بغلیں جھانکنا: (الف) انسب میرے سوال پر بغلیں جھانکنے لگا۔
(ب) کسی کی بغلیں جھانکنا بُری بات ہے۔

افسانہ:

''پنچایت'' پریم چند کا افسانہ ہے۔ افسانہ ایسی کہانی کو کہتے ہیں، جس میں زندگی کے کسی ایک واقعے، پہلو یا کردار کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اختصار، وحدتِ تاثر اور جامعیت اس کی بنیادی صفات ہیں۔

خط:

ہم سب دوسروں سے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اپنے خیالات، اپنے حالات اور اپنے جذبات میں دوسروں کو شریک کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اگر اس خواہش کی تکمیل لکھ کر کی جائے تو اسے خط نویسی کہا جائے گا۔

خط دو قسم کے ہوتے ہیں: رسمی اور غیر رسمی

رسمی خط: وہ خط ہوتے ہیں جو کسی صاحبِ اختیار کو بھیجے جاتے ہیں اور ان میں عام طور پر اپنے حالات و مسائل سے اسے آگاہ کیا جاتا ہے اور ان مسائل کے حل کے لیے ایک طرح سے درخواست کی جاتی ہے۔ اسی لیے رسمی خط اور درخواست میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اخبارات کے مدیروں کو لکھے گئے خطوط بھی رسمی خطوط کہلاتے ہیں۔

جب کہ غیر رسمی خطوط وہ ہیں جو اپنے دوستوں، عزیزوں، والدین اور بے تکلف جاننے والوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ چونکہ ان خطوط میں اپنے جذبات اور خیالات کا بے ساختہ ذکر ہوتا ہے، اس لیے انھیں آدھی ملاقات بھی کہا گیا ہے۔

ایک اچھے خط کے لیے ضروری ہے کہ خط اس طرح لکھا جائے جیسے مکتوب الیہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک اچھے خط میں بے تکلفی سے مگر مکتوب الیہ کے مرتبے اور اس سے اپنے رشتے کا لحاظ رکھ کر باتیں لکھی جاتی ہیں۔ تحریر کے حُسن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

خط کے حصے درجِ ذیل ہوتے ہیں:

ا۔ مقامِ روانگی اور تاریخ

۲۔ القاب وآداب

۳۔ خط کا مضمون

۴۔ اختتامِ مکتوب

۵۔ مکتوب نگار کا نام

۶۔ مکتوب الیہ کا پتا

مقامِ روانگی اور تاریخ کاغذ کی پیشانی پر انتہائی دائیں جانب درج ہوتے ہیں۔ القاب وآداب، مکتوب الیہ سے اپنے تعلق اور مکتوب الیہ کے مرتبے ومنصب کی نسبت سے لکھے جاتے ہیں۔ اپنے والدین کے لیے احترام وعقیدت کے القاب اختیار کیے جاتے ہیں، جب کہ دوستوں سے بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے۔ اختتامِ مکتوب کسی دعا پہ کرنا چاہیے اور اپنا نام خط کے آخر میں بائیں جانب صفحے پر لکھنا چاہیے۔ صفحے کے آخر پر دائیں جانب خالی جگہ پر مکتوب الیہ کا پورا پتا درج آنا چاہیے۔

سرگرمیاں:

۱۔ دوست کے نام خط لکھ کر پریم چند کے افسانے پڑھنے کا مشورہ دیں اور افسانہ ''پنچایت'' کا تعارف کرائیں۔

۲۔ اپنے استاد سے پوچھ کر پریم چند کا کوئی اور افسانہ پڑھیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ دینِ اسلام نے بھی عدل وانصاف کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

۲۔ طلبہ کو ''پنچایت'' کے نظام سے آگاہ کریں کہ یہ کس طرح معاملات کو انجام دیتا ہے۔

۳۔ عدل وانصاف اور حق گوئی پر مبنی طلبہ کو، کوئی اور کہانی یا واقعہ سنائیں۔

۴۔ یہ افسانہ پڑھانے سے پہلے افسانوی ادب اور خصوصاً پریم چند کے افسانوں کے بارے میں معلومات دی جائیں۔

سیّد امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء..........۱۹۷۰ء)

سیّد امتیاز علی تاج لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، مولوی ممتاز علی کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ امتیاز علی تاج نے سنٹرل ماڈل سکول لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں منفرد انگریزی ڈراموں کے تراجم کر کے سٹیج پر پیش کیے۔ ۱۹۳۲ء میں مشہورِ زمانہ ڈراما ''انار کلی'' لکھا۔ ان کے مزاحیہ سکیچ ''چچا چھکن'' کے نام سے شائع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے۔ رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کے مدیر رہے۔ ریڈیو پروگرام ''پاکستان ہمارا ہے'' شروع کیا اور ریڈیو کے لیے درجنوں ڈرامے اور فیچر لکھے۔ بہت سی فلمی کہانیاں بھی ان کی تحریر کردہ ہیں۔ وہ مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور کے سیکرٹری بھی رہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں ان کو نامعلوم شخص نے قتل کر دیا۔

امتیاز علی تاج کے ڈراموں میں تمام لسانی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کی تحریر سادہ اور بے تکلّف ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں اور معمولی الفاظ کو بھی اتنی خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ قاری کے ذہن پر گہرا اثر مرتّب کرتے ہیں۔ اُن کے ڈراموں کی زبان سلیس اور رواں ہے۔

امتیاز علی تاج کرداروں کی تخلیق میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو نفسیاتی تجزیے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ محض کٹھ پُتلی نہیں ہوتے بلکہ جاندار، زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔

امتیاز علی تاج کے ڈراموں میں چُستی، برجستگی اور بے ساختگی ملتی ہے۔ کسی ڈرامے کی کامیابی کا دارومدار اس کے مکالموں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مکالمہ نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کے ہاں جذبات نگاری کی ایسی حسین مثالیں ملتی ہیں جو اردو کے ڈرامائی ادب میں بہت کم دستیاب ہیں۔

ان کا ایک معروف ڈراما ''آرام و سکون'' اس کی واضح مثال ہے کہ اُن کے مزاح میں کہیں کوئی تکلف نظر نہیں آتا۔ بس اُنھوں نے معمول کے واقعات اور کرداروں کے سیدھے سادے مکالموں سے مزاح پیدا کیا ہے۔

سیّد امتیاز علی تاجؔ

آرام و سکون

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو سنجیدہ تحریر اور مزاحیہ تحریر کے فرق سے روشناس کرانا۔
۲۔ طلبہ کو بتانا کہ مزاحیہ تحریر صرف ہنسنے ہنسانے کی چیز نہیں بلکہ اس کے بین السطور پوشیدہ پیغام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔
۳۔ طلبہ کو انسانی معاشرے کے مختلف کرداروں کے بول چال سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ کو مکالمہ نگاری کے فن سے متعارف کرانا۔
۵۔ اس مزاحیہ تحریر کے توسط سے بیمار کی تیمار داری کے طریقے اور سلیقے سے آگاہ کرنا۔

ڈاکٹر: جی نہیں بیگم صاحبہ! تردّد کی کوئی بات نہیں، میں نے بہت اچھی طرح معائنہ کرلیا ہے۔ صرف تکان کی وجہ سے حرارت ہوگئی ہے۔ ان دنوں آپ کے شوہر غالباً کام بہت زیادہ کرتے ہیں۔

بیوی: ڈاکٹر صاحب! ان دنوں کیا، ان کا ہمیشہ سے یہی حال ہے۔ صبح دس بجے دفتر جا کر شام سات بجے سے پہلے کبھی واپس نہیں آتے۔

ڈاکٹر: جبھی تو! میرے خیال میں انھیں دوا سے زیادہ آرام وسکون کی ضرورت ہے۔ کاروبار کی پریشانیاں اور اُلجھنیں بُھلا کر ایک بھی روز آرام وسکون سے گزرا تو طبیعت اِن شاءاللہ بحال ہو جائے گی۔

بیوی: بیسیوں مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ اتنا کام نہ کیا کرو۔ نصیبِ دشمناں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے مگر خاک اثر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں کہ کیا کیا جائے، ان دنوں کام بے طرح زوروں پر ہے۔

ڈاکٹر: ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام وسکون کے لیے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

بیوی: یہ بات آپ نے انھیں بھی سمجھائی؟ میں نے کہا سُن رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟

میاں: ہوں!

ڈاکٹر: جی ہاں! میں نے سمجھا کر اچھی طرح تاکید کردی ہے کہ دن بھر خاموش لیٹے رہیں۔

بیوی: تو تاکید کیا میں نہیں کرتی؟ مگر ان پر کسی کے کہنے کا کچھ اثر بھی ہو!

ڈاکٹر: جی نہیں! ابھی انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ پورے طور سے میری ہدایات پر عمل کریں گے۔

بیوی: اور دوا کس کس وقت دینی ہے؟

ڈاکٹر: جی نہیں! دوا کی مطلق ضرورت نہیں۔ بس آپ صرف ان کے آرام وسکون کا خیال رکھیے۔ غذا جو کچھ دینی ہے، میں لکھ چکا ہوں۔

بیوی: بڑی مہربانی آپ کی۔

ڈاکٹر: تو پھر اجازت۔

بیوی: فیس میں آپ کو بھجوا دوں گی۔

ڈاکٹر: اس کی کوئی بات نہیں۔ آ جائے گی۔

بیوی: (اونچی آواز سے پکار کر) ارے للّو! میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کا بیگ باہر کار میں پہنچا دیجیو۔

ڈاکٹر: ایک بات عرض کر دوں بیگم صاحب! مریض کے کمرے میں شور غل نہیں ہونا چاہیے۔ اعصاب پر اس کا بہت مضر اثر پڑتا ہے۔ خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی تقویّت بخشتی ہے۔

بیوی: مجھے کیا معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب؟ آپ اطمینان رکھیں ان کے کمرے میں پرندہ پر نہ مارے گا۔ (ملازم آتا ہے)

للّو: حضور!

ڈاکٹر: اٹھا لو یہ بیگ۔ تو آداب!

بیوی: آداب! (ڈاکٹر اور ملازم جاتے ہیں۔ قریب آ کر) میں نے کہا سو گئے کیا؟

میاں: ہوں! یونہی چُپکا پڑا ہوا تھا۔

بیوی: بس بس۔ بس بس چپکے ہی پڑے رہیے۔ ڈاکٹر صاحب بہت سخت تاکید کر گئے ہیں کہ نہ آپ بات کریں نہ کوئی آپ کے کمرے میں بات کرے۔ اس سے بھی تکان ہوتی ہے۔ تمام وقت پورے آرام وسکون سے گزاریں۔ سمجھ گئے نا؟

میاں: ہوں (کراہتا ہے)

بیوی: کیوں بدن ٹوٹ رہا ہے کیا؟

میاں: ہوں!

بیوی: کہو تو دبا دوں؟

میاں: ہوں!

بیوی: سونے کو جی چاہ رہا ہو تو چلی جاؤں؟

میاں: اچھی بات۔ (کراہتا ہے)

بیوی: اگر پیچھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو؟ اچھا بُلانے کی گھنٹی پاس رکھے جاتی ہوں۔ گھنٹی کہاں گئی؟ رات میں نے آپ یہاں میز پر رکھی تھی۔ اللہ جانے یہ کون اللہ مارا میری چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے؟ (کُنڈی کی آواز) کون ہے یہ نامراد؟ ارے للّو! دیکھو، یہ کون کواڑ توڑے جا رہا ہے؟ للّو (دور سے) سقّا ہے بیوی جی!

بیوی: سقّا؟ گھر میں بہرے بستے ہیں جو کم بخت اس زور سے کنڈی کھٹکھٹاتا ہے؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا کہ گھر

میں کوئی بیمار پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے تاکید کر رکھی ہے کہ شور غل نہ ہونے پائے اور اس سے کہو یہی وقت ہے پانی لانے کا۔ اچھی خاصی دوپہر ہونے کو آ گئی ہے۔ کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری سے الگ کر دوں گی۔ میں نامُراد کو بیسیوں مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے۔ کان پر جُوں نہیں رینگتی۔

میاں: ارے بھئی اب بخشو اسے۔

بیوی: بخشوں کیسے؟ ذرا طرح دو تو یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

میاں: ہوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: کیوں، زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے؟

میاں: ہوں۔

بیوی: للّو سے کہوں آ کر دبا دے؟

میاں: اوں ہوں؟

بیوی: یہ دیکھو۔ یہاں انگیٹھی پر رکھی ہے۔ آپ بتایئے آپ سے آپ آ گئی یہاں؟ پاؤں تھے اس کے؟ یہ سب حرکتیں اس للّو کی ہیں۔ کم بخت نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر نہ رہنے دے گا۔ اللہ جانے یہ نامُراد میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا کیوں ہے؟ للّو! ارے للّو!

میاں: ارے بھئی کیوں ناحق غل مچا رہی ہو۔ گھنٹی رات میں نے خود میز پر سے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دی تھی۔ ہوں! (کراہتا ہے)

بیوی: تم نے؟ اے ہے وہ کیوں؟

میاں: ننھا بار بار بجائے جا رہا تھا۔ میرا دم اُلجھنے لگا تھا۔ (کراہتا ہے)

للّو: (آ کر) مجھے بُلایا ہے بیوی جی؟

بیوی: کم بخت اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں، کہاں مر گیا تھا؟

للّو: گودام سے ریٹھے ڈھونڈ رہا تھا۔

بیوی: صبح سویرے کہا تھا، کم بخت تجھے اب تک ریٹھے مل نہیں چکے؟

للّو: جی مہلت بھی ملے۔ اِدھر گودام میں جاتا ہوں، اُدھر کوئی بُلا لیتا ہے۔

بیوی: ہاں بڑا کام رہتا ہے نا! بچارے کو سر کھجانے کو فرصت نہیں ملتی۔ بھاگ یہاں سے......نکل، جا کر ریٹھے ڈھونڈ (للّو جاتا ہے) تو یہ گھنٹی یہاں تمھارے سرہانے رکھ جاتی ہوں۔

میاں: (کراہ کر) کواڑ بند کرتی جانا۔

بیوی: پیچھے اکیلے میں جی تو نہ گھبرائے گا تمھارا؟

میاں: (تنگ آ کر) نہیں بابا نہیں۔

بیوی: ارے ہاں۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں لکھ گئے ہیں۔ کہاں گیا ان کا لکھا ہوا کاغذ؟ اے لو یہ نیچے پڑا ہوا ہے۔ ابھی کہیں کُوڑے میں چلا جاتا تو۔ ہوں۔ مالٹڈ ملک (Malted Milk)، نارنگی کا رس، ساگودانے کی کھیر، کیا تیار کرا دوں اس وقت کے لیے؟

میاں: جو جی چاہے۔

بیوی: اس میں میرے جی چاہنے کا کیا سوال؟ کھانا آپ کو ہے یا مجھے؟

میاں: ساگودانہ بنا دینا تھوڑا سا۔

بیوی: بس! اس سے کیا بنے گا؟ یخنی پی لیتے تھوڑی سی۔ چوزے کی یخنی بنوائے دیتی ہوں۔ مقوّی چیز ہے۔

میاں: بنوا دو۔

بیوی: (دو قدم چلتی ہے) مگر میں نے کہا۔ دیر لگ جائے گی یخنی کی تیاری میں، چوزہ بازار سے منگوانا ہوگا۔ اس للّو کو تو جانتے ہو۔ بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے۔

میاں: اوں ہوں۔

بیوی: تو پھر یوں کرتی ہوں۔ (صحن میں بچہ پٹ پٹ گاڑی چلانے لگتا ہے)

میاں: ارے بھئی، اب یہ کیا کھٹ پٹ شروع ہوگئی۔

بیوی: ننھا ہے آپ کا۔ عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا۔ نہ اس کم بخت کا دل اس سے بھرتا ہے نہ وہ کم بخت ٹوٹتی ہے۔ ارے میں نے کہا ننھے، نہیں مانے گا نامُراد؟ چھوڑ اس اپنی پٹ پٹ کو۔ جب دیکھو لیے پھر رہا ہے۔ صاحبزادے کا دل کسی طرح پُر ہونے ہی میں نہیں آتا۔ چولھے میں جھونک دوں گی اس کم بخت کو، اتنا خیال بھی نہیں آتا ابّا بیمار پڑے ہیں۔ شور غُل سے ان کی طبیعت گھبراتی ہے۔

میاں: ہوں۔ (کراہتا ہے)

بیوی: کم نہیں ہوا درد؟

میاں: اوں ہوں۔

بیوی: تو میں کیا کہ رہی تھی؟ کھانے کا پوچھ رہی تھی۔

(پھر ننھے کی پٹ پٹ کی آواز) پھر وہی۔ نہیں مانے گا نامُراد، ٹھہر تو جا (غصّے میں جاتی ہے۔ میاں کراہتا ہے۔ دُور سے بیوی کی آواز آ رہی ہے)

چھوڑ اپنی یہ پٹ پٹ۔ (بچہ رونے لگتا ہے) چُپ نامراد، اتنا خیال نہیں ابّا بیمار پڑے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے شور غل نہ ہو، نہیں تکلیف ہوگی۔ چُپ! خبردار جو آواز نکالی۔ گلا گھونٹ ڈالوں گی۔ (بچہ رونا بند کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) کم بخت کا جو کھیل ہے، ایسا ہی بے ڈھنگا ہے۔ چل ادھر۔ نہیں چپ ہوگا تو؟ (کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے۔ میاں اس ہنگامے سے زِچ ہو کر کراہے جا رہا ہے۔ بیوی کی آواز غائب ہوتے ہی کمرے میں جھاڑو پھرنے کی آواز آنے لگتی ہے۔)

میاں: (چونک کر) ہوں؟ ارے بھئی یہ گرد کہاں سے آنے لگی؟ لاحول ولاقوۃ۔ ارے کیا ہو رہا ہے؟

ملازم: جھاڑو دے رہا ہوں میاں۔

میاں: کم بخت دفع ہو یہاں سے۔

ملازم: بی بی جی......

میاں: بی بی جی کا بچہ نکل یہاں سے۔ کہہ دے ان سے (ملازم جاتا ہے) کواڑ بند کر کے جا۔ (میاں کراہ کر چُپ ہو جاتا ہے، ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہتی ہے) ارے بھئی کہاں گئیں؟ ارے کوئی ٹیلی فون سننے تو آؤ۔ لاحول ولاقوۃ۔ (خود اٹھتا ہے) ہیلو، میں اشفاق بول رہا ہوں۔ بیگم اشفاق کسی کام میں مصروف ہیں۔ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں جی۔ یہاں کوئی ایسا نہیں جو انھیں بُلا لائے۔ میں علیل ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے؟ آواز دینے کے لیے ضروری نہیں کہ گلا بھی خراب ہو۔ آپ پھر کسی وقت فون کر لیجیے گا۔ میں نے عرض کیا نا، چونکہ میں بیمار ہوں، کمرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ (زور سے فون بند کرتا ہے) بدتہذیب۔ گستاخ کہیں کی۔ ہوں۔

بیوی: مجھے بلایا تھا؟ ہے ہے تم اٹھے کیوں۔

میاں: اتنی آوازیں دیں کوئی سنے بھی۔

بیوی: توبہ توبہ، لیٹو لیٹو، میں ذرا گودام میں چلی گئی تھی۔ للّو کو ریٹھے نکال کر دے رہی تھی۔ بلایا کیوں تھا؟ (ہمسائے کے ہاں گانا شروع ہوتا ہے۔)

میاں: فون تھا تمھارا۔

بیوی: کس نے کیا تھا؟

میاں: ہوگا کوئی۔ اب مجھے کیا پتا؟

بیوی: جب اٹھ ہی کھڑے ہوئے تھے تو نام پوچھ لینا کوئی گناہ تھا؟

میاں: میں نے کہہ دیا تھا پھر کر لیں فون۔

بیوی: مفت کی الجھن میں ڈال دیا۔ اللہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی؟

میاں: ارے بھئی کوئی ایسا ضروری کام نہیں تھا ورنہ مجھے پیغام نہ دے دیتیں۔ تم خدا کے لیے ان ہمسائے کے صاحب زادے کا ہارمونیم اور گانا بند کراؤ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

بیوی: اب اسے کیوں کر روک دوں میں؟

میاں: بابا ایک دفعہ لکھ کر بھیج دو۔ میں بیمار ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے میرے لیے آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ ایک روز ان صاحب زادے نے نغمہ سرائی نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی۔

بیوی: کہے تو دیتی ہوں مگر کہیں چڑ نہ جائیں۔

میاں: مناسب الفاظ میں لکھونا۔ ہوں (کراہتا ہے)

(بے سُرے گانے کا شور جاری ہے۔ میاں کراہ رہا ہے۔ یک لخت بچے کے رونے کی آواز)

بیوی: ارے کیا ہو گیا ننھے؟

بچہ: (زور سے) گر پڑا، خون نکل آیا۔

بیوی: (زور سے) خط لکھ رہی ہوں۔ ابھی آئی، چپ ہو جا۔

میاں: (کراہتے ہوئے) یک نہ شُد دو شُد۔

بیوی: توبہ آپ تو بوکھلا دیتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں، خط لکھ رہی ہوں۔ بچے کو چُپ کیوں کر کرا سکتی ہوں؟ نامراد چُپ ہو جا۔ خون نکل آیا تو کیا قیامت آ گئی؟ ابھی آ رہی ہوں دو سطریں لکھ لوں۔

میاں: ختم نہیں ہوا خط؟ جانے کیا دفتر لکھنے بیٹھ گئی ہو۔

بیوی: ابھی ہوا جاتا ہے ختم۔

(اس غل میں ایک فقیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے۔)

فقیر: بال بچے کی خیر۔ راہِ مولا کچھ مل جائے فقیر کو۔

میاں: (کراہ کر) بس ان ہی کی کسر رہ گئی تھی۔ ہوں۔

بیوی: تو اب میں تو اسے بلا کر لے نہیں آئی۔

میاں: ارے تو خدا کے لیے اسے رخصت تو کر آؤ۔

بیوی: اوللّو! ارے اوللّو!

(للّو ہاون دستے میں ریٹھے کوٹنے شروع کر دیتا ہے۔ بے سُرے گانے میں بچے کے رونے، فقیر کی صدا اور ہاون دستے کی دھمک شامل ہو جاتی ہے۔)

میاں: ہائے! توبہ، توبہ، ہائے!

بیوی: ارے نامراد ریٹھے پھر کُوٹ لینا۔ پہلے اس فقیر کو رخصت تو کر دے (للّو ریٹھے کوٹنے میں بیوی کی آواز نہیں سنتا)

میاں: (جلدی جلدی کراہتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔) میری ٹوپی اور شیروانی دینا۔

بیوی: ٹوپی اور شیروانی!!

میاں: ہاں میں دفتر جا رہا ہوں۔ ابھی دفتر جا رہا ہوں۔

بیوی: ہے ہے وہ کیوں؟

میاں: آرام و سکون کے لیے۔

مشق
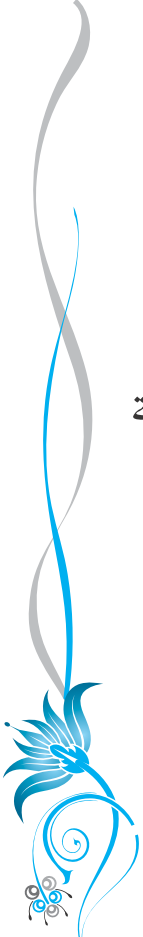
۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) روزانہ آرام وسکون نہ کیا جائے تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

(ب) بیماری کے باوجود میاں دفتر جانے کے لیے کیوں تیار ہو جاتا ہے؟

(ج) اس ڈرامے سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

(د) بہت زیادہ شور غل بھی ماحولیاتی آلودگی کا سبب بنتا ہے۔شور کی آلودگی سے صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

(ہ) صحت مند رہنے کے لیے کیا باتیں ضروری ہیں؟

(و) ہمسائے کی کون سی حرکت سے میاں کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا؟

۲۔ واحد کی جمع اور جمع کے واحد لکھیں۔

وقت،ضرورت،ہدایات،غذا،طبیعت،ہمسائے

۳۔ مندرجہ ذیل کے مذکر اور مؤنث لکھیں۔

بیگم،بیوی،فقیر،ملازم،بچہ

۴۔ مندرجہ ذیل جملوں کو درست کر کے لکھیں۔

(الف) میرے ابّو دفتر سے واپس لوٹ آئے ہیں۔

(ب) ڈاکٹر نے مریض کو دوائی دی۔

(ج) میرے پیٹ میں درد ہو رہی ہے۔

(د) یہ میز پرانا ہو چکا ہے۔

(ہ) نوکر نے کمرے میں جھاڑو دیا۔

۵۔ غلط اور درست بیانات کی (✓) سے نشاندہی کریں۔

(الف) انسان کو بہت زیادہ فکر مند نہیں رہنا چاہیے۔ درست غلط

(ب) شور غل کا مریض پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ درست غلط

(ج) تھوڑا سا وقت آرام کے لیے ضرور نکالنا چاہیے۔ درست غلط

(د) ہمیں ماحول کو آلودہ نہیں کرنا چاہیے۔ درست غلط

(ہ) صرف تکان کی وجہ سے حرارت نہیں ہو سکتی۔ درست غلط

(و) دوا سے زیادہ آرام وسکون ضروری ہے۔ درست غلط

(ز) بغیر آرام کیے محنت کرتے چلے جانے سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ درست غلط

(ح) غذا کے معاملے میں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ درست غلط

(ط) گرد و غبار سے صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ درست غلط

(ی) انسان کے لیے آرام و سکون بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کام۔ درست غلط

۶۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

تردد، معائنہ، مطلق، شورغل، تقویت، مقوی

۷۔ درست جواب کے آگے (✓) کا نشان لگائیں۔

(الف) سبق ''آرام و سکون'' کے مصنف کون ہیں؟

(i) پریم چند (ii) سیّد امتیاز علی تاج

(iii) مولوی نذیر احمد (iv) میرزا ادیب

(ب) ڈاکٹر کے مطابق میاں کو کیا بیماری تھی؟

(i) شوگر (ii) دل کی بیماری

(iii) تکان اور حرارت (iv) سر درد

(ج) میاں کتنے بجے دفتر جایا کرتے تھے؟

(i) صبح آٹھ بجے (ii) شام سات بجے

(iii) صبح دس بجے (iv) صبح نو بجے

(د) ڈاکٹر نے میاں کو کس بات کی تاکید کی تھی؟

(i) وقت پر دوا کھانے کی (ii) انجکشن لگوانے کی

(iii) خاموش لیٹے رہنے کی (iv) سیر کرنے کی

(ہ) سبق ''آرام و سکون'' میں گھریلو ملازم کا نام کیا تھا؟

(i) کلّو (ii) للّو

(iii) بلّو (iv) ٹلّو

(و) گھنٹی کس نے میز سے اُٹھا کر انگیٹھی پر رکھی تھی؟

(i) بیوی نے (ii) میاں نے

(iii) للّو نے (iv) ننھے نے

(ز) میاں صاحب کا نام کیا تھا؟

(i) اشتیاق (ii) مشتاق

(iii) اشفاق (iv) اسحاق

(ح) ملازم کیا چیز کوٹ رہا تھا؟

(i) نمک (ii) مرچیں

(iii) ریٹھے (iv) گرم مسالا

۸۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) تردّد کی کوئی بات نہیں، میں نے بہت اچھی طرح .... کرلیا ہے۔
(ب) میرے خیال میں انھیں .... سے زیادہ .... کی ضرورت ہے۔
(ج) اتنا کام نہ کیا کرو .... صحت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔
(د) جی نہیں! دوا کی .... ضرورت نہیں۔
(ہ) مریض کے کمرے میں .... نہیں ہونا چاہیے۔
(و) خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی .... بخشتی ہے۔
(ز) اللہ جانے یہ کون .... میری چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتا ہے۔
(ح) .... کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے۔
(ط) میں .... کو .... مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے۔
(ی) .... نے قسم کھا رکھی ہی کہ کبھی کوئی چیز .... پر نہ رہنے دے گا۔
(س) .... کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔
(ص) صاحب زادے نے .... نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی۔

سرگرمیاں:

۱۔ طلبہ سے کہیں کہ وہ سیّد امتیاز علی تاج کا کوئی اور مزاحیہ ڈراما تلاش کر کے پڑھیں۔
۲۔ ڈاکٹر اور مریض کے درمیان مکالمہ تحریر کریں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتائیں کہ مزاحیہ ادب، معاشرے کے ناہموار پہلوؤں کو دلچسپ اور شگفتہ انداز میں موضوع بناتا ہے۔
۲۔ بچوں کو بتائیں کہ مزاح نگار کا مقصد، تفنّنِ طبع کے ساتھ ساتھ اصلاحِ احوال بھی ہوتا ہے۔
۳۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ مریض کی عیادت کے اسلامی طریقے کو وضاحت سے بیان کریں۔
۴۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ "آرام و سکون" کی تدریس سے پہلے طلبہ کو مختصر اور مزاحیہ ڈرامے سے متعارف کرائیں۔
۵۔ امتیاز علی تاج کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے دیگر مزاحیہ ڈراموں مثلاً "بیگم کی بلی" کا ذکر کیا جائے۔

میرزا ادیب

(۱۹۱۴ء............۱۹۹۹ء)

میرزا ادیب کا اصلی نام دلاور علی اور قلمی نام میرزا ادیب ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے آنرز کیا۔

میرزا ادیب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں بہت سی علمی و ادبی شخصیتیں موجود تھیں جنھوں نے میرزا کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاونت کی۔ میرزا نے ابتدا میں شعروشاعری کی طرف توجہ دی مگر جلد ہی اسے ترک کر کے افسانہ اور ڈراما نگاری کی طرف آ گئے۔

انھوں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ ''ادبِ لطیف'' کی ادارت سنبھالی اور طویل عرصے تک اس سے وابستہ رہے۔ پھر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔

میرزا ادیب یک بابی اور ریڈیائی ڈراما نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد اُردو ادب میں یک بابی ڈرامے کو جو فروغ ملا، اس میں میرزا ادیب نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے نبض شناس تھے، اس لیے ان کے ڈراموں کے موضوعات عام اور روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں۔ اپنے معاشرے کی انسانی خواہشات اور توقعات کو میرزا ادیب نے خاص اہمیت دی ہے۔

میرزا ادیب نے کردار نگاری کے سلسلے میں بھی گہرے مشاہدے، انمول بصیرت اور فنکارانہ گرفت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے عام کرداروں کو ڈرامائی کرداروں کا درجہ دیا ہے۔ ان کے مکالمے نہایت برجستہ، مختصر اور برمحل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں قاری یا ناظر کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے جو کسی کامیاب ڈراما نگار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے ڈراموں کے اہم مجموعوں کے نام یہ ہیں: ''آنسو اور ستارے''، ''لہو اور قالین''، ''ستون''، ''فصیلِ شب''، ''خاک نشیں''، ''پسِ پردہ'' اور ''شیشے کی دیوار''۔ ان کے علاوہ ''صحرانورد کے خطوط''، ''صحرانورد کے رومان'' اور ''مٹی کا دِیا'' (آپ بیتی) ان کی زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔

میرزا ادیب

لہو اور قالین

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو میں سنجیدہ ڈراموں کی روایت سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو اپنے معاشرے میں موجود ریاکار کرداروں سے روشناس کرانا۔
۳۔ تحریر کے ذریعے جذبوں کے اظہار کے سلیقے سے متعارف کرانا۔

کردار

بابا .... نوکر
تجمل .... ایک سرمایہ دار
اختر .... مصوّر
رؤف .... تجمل کا پرائیویٹ سیکرٹری

منظر

سردار تجمل حسین کی کوٹھی ''النشاط'' کا ایک وسیع کمرا۔ یہ کمرا اختر اسٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ، فرش پر قالین، دیواروں پر مشہور مصوّروں کے شاہکار۔ ایک طرف ریڈیو سیٹ۔ کچھ فاصلے پر صوفا سیٹ اور کرسیاں۔ شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی دونوں الماریوں میں مجلد کتابیں۔ کارنیس اور تپائیوں کے اوپر تر و تازہ پھولوں سے مزیّن گل دان، دروازے اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے۔ وسط میں ایزل پر کینوس جو ابھی تک سادہ اور صاف ہے۔ قریب ایک تپائی پر رنگوں کے ڈبے، چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طرح طرح کے قلم اور مصوّری کا دوسرا سامان۔ گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک صبح، روشن دانوں میں سے دھوپ اندر آ رہی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو بابا جھاڑن سے کمرے کی چیزیں صاف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دو چار لمحوں کے بعد تجمل آتا ہے۔ تجمل کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی، صحت نہایت اچھی، جسم پر قیمتی سوٹ۔

تجمل: یہ اختر کہاں ہے بابا؟

بابا: اُدھر باغ میں ہیں سرکار!

تجمل: ابھی تک باغ میں۔ وہاں کیا کر رہے ہیں؟

بابا: ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا بھی، سرکار ناشتا تیار ہے اندر آ جائیں، مگر انھوں نے تو مجھے جھڑک دیا۔ ابھی تک دھوپ میں ٹہل رہے ہیں۔ رات سرکار (خاموش ہو جاتا)

تجمل: رات کیا؟

بابا: میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہوا یہ سرکار کہ میری اچانک آنکھ کُھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ شور مچانے ہی والا تھا کہ اختر میاں کے ہاتھ میں اُن کی چھڑی نظر آ گئی۔

تجمل: اس قسم کے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے، ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں، الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔

بابا: سرکار! میں تو نہ خود یہاں آتا ہوں اور نہ کسی کو یہاں آنے دیتا ہوں۔ ذرا صفائی کے لیے پانچ دس منٹ کے لیے آجاتا ہوں۔ میں نے کہا سرکار!

تجمل: کیا ہے؟

بابا: شاید کچھ ایسے ایسے ہیں چند روز سے۔

تجمل: پھر وہی بات، ایک بار کہہ جو دیا، تم فن کاروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ہر وقت یوں ہی پریشان رہتے ہیں۔

بابا: (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) اچھا سرکار!

تجمل: بلا لاؤ انھیں، جلدی کرو۔

بابا: بہتر! (بابا کمرے سے نکل جاتا ہے۔ تجمل آگے بڑھ کر کینوس کو دیکھنے لگتا ہے، اختر آتا ہے، ادھیڑ عمر کا شخص، سر کے بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سرخ، لباس پاجامہ اور قمیص۔ آستینیں چڑھی ہوئیں، آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں)

اختر: (تجمل کی طرف دیکھے بغیر) کہیے!

تجمل: بڑی دیر تک ٹہلتے رہے ہو آج۔

اختر: جی ہاں۔

تجمل: ایک بہت بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں تمھیں، ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فون کیا ہے، ججوں نے تمھاری تصویر کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لیے رؤف کو بھیج دیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔

اختر: مجھے اخبار سے معلوم ہو چکا ہے۔

تجمل: (اختر کی بے نیازی پر متعجب) تمھیں اس کا علم تھا اور۔

اختر: اخبار صبح سویرے مل جاتا ہے۔

تجمل: تمھیں یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ میرا خیال ہے یہ تمھارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ (اختر خاموش ہے) تم نے ملک کے تمام مصوّروں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ میں نے اس خوشی پر آج شام

چائے کا اہتمام کیا ہے۔ تمھیں مبارک باد دینے شہر کے معززین آرہے ہیں۔ سنا تم نے؟

(اختر خاموش ہے)

تجمل: کیا کہا؟

اختر: کچھ نہیں۔

تجمل: کچھ نہیں! (اختر کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) شاید بابا نے غلط نہیں کہا تھا۔ معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

اختر: جی نہیں۔

تجمل: اس نے کہا تھا (مسکرا کر) ہمارے مصوّر کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے ان دنوں، تمھارا کیا خیال ہے اپنا؟

اختر: صحیح کہا تھا اس نے!

تجمل: یعنی کہ............

اختر: یہی کہ یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

تجمل: کیا کہا؟ (لہجے میں حیرت) رخصت ہونے کی ضرورت؟

اختر: میرا دل چاہتا ہے۔

تجمل: کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟

اختر: کوئی شکایت نہیں۔

تجمل: پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف کیوں نہیں کہ دیتے۔ تمھارے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا اور کیا کچھ نہیں کیا جائے گا؟

اختر: میں اس کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں، پھر بھی۔

تجمل: پھر بھی کا کیا مطلب؟

اختر: مجھے جانا ہی چاہیے۔

تجمل: بے وقوف نہ بنو اختر! یہ بیٹھے بیٹھے آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

اختر: اس کا جواب دے چکا ہوں۔

تجمل: اگر تمھیں کچھ نہیں ہوا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچو تو، یہاں آکر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ کتنی زبردست قدر و منزلت حاصل کی ہے، اس سے بڑی عزت کیا ہوگی کہ آج تم ملک کے بہترین مصوّر سمجھے جاتے ہو اور کیا چاہیے تمھیں؟

اختر: اس کے لیے میں آپ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تجمل: مجھے شکریے کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بتاؤ تمھیں تکلیف کیا ہے؟ کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے اور کیا چاہیے تمھیں؟

اختر: مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ رخصت ہونے کی اجازت دیجیے۔

تجمل: اس پاگل پن کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہوں؟

اختر: آخر کیوں؟

تجمل: اس کی وجہ تم نہیں جانتے کیا؟

(اختر خاموش رہتا ہے) سنا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دورے بھی پڑتے ہیں۔ شاید (اختر کی طرف مُسکرا کر دیکھتا ہے، اختر کا چہرہ بدستور سنجیدہ ہے) کچھ اس قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اختر: مجھے مجبور نہ کیجیے۔

تجمل: کیا حماقت ہے! ایک شخص کو دلدل سے نکالا جاتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں چھلانگ لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اختر: میرے فن کی بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔

تجمل: فن کی بات کرتے ہو۔ یہاں آنے سے پہلے بھی تمھارے پاس فن تھا اور...... آج بھی ہے، مگر دونوں میں کتنا فرق ہے؟ تم خود نہیں جانتے یہ فرق؟

اختر: کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کا شکر گزار نہیں ہوں!

تجمل: اختر!

اختر: فرمایئے۔

تجمل: اگر تم سنجیدگی سے یہ بات کر رہے ہو، تو سُن لو، میں تمھیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میری توہین ہے، لوگ کیا کہیں گے؟

اختر: لوگوں کو میرے اور آپ کے ذاتی معاملے سے کیا واسطہ؟

تجمل: تم دنیا سے الگ تھلگ رہ کر مصوّری کرتے رہتے ہو۔ تمھیں معلوم نہیں لوگ اس قسم کے واقعے پر کیا کچھ کرتے ہیں۔ سب کہیں گے ایک غریب اور قلاّش مصوّر کو جھونپڑی میں سے نکال کر لایا، دکھاوے کے لیے اور پھر اُسے واپس بھیج دیا، کیا یہ میری توہین نہیں ہے؟
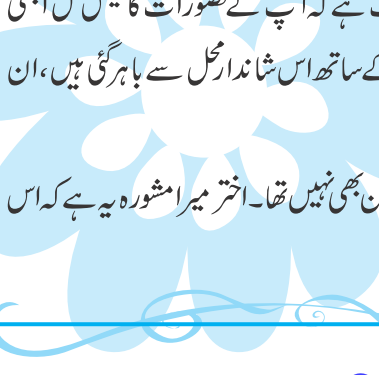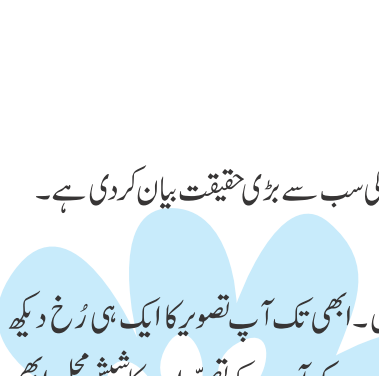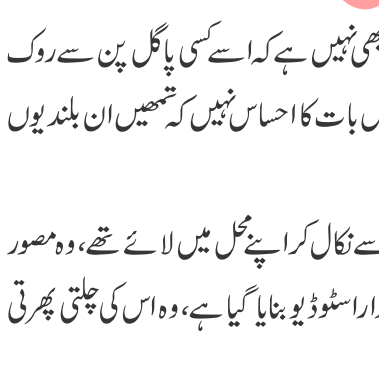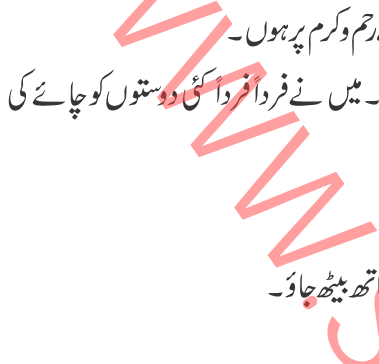
اختر: (بھونچکا ہوکر) توہین؟ توہین کیسی؟

تجمل: اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اختر: صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے اور اب میں آپ کے رحم وکرم پر ہوں۔

تجمل: یہ بات نہیں ہے، اختر (ملائمت سے) غور کرو کتنی عجیب حالت ہوگی میری۔ میں نے فرداً فرداً کئی دوستوں کو چائے کی دعوت دے دی ہے، وہ ضرور شام کو آئیں گے۔

اختر: میرے جانے یا نہ جانے سے اس دعوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

تجمل: میں سمجھتا ہوں نا فرق پڑتا ہے۔ اب اس پاگل پن کو چھوڑو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔

اختر: آپ مجھے اس طرح روک نہیں سکتے۔

تجمل: روک نہیں سکتے! خوب! جس شخص کو میں اپنا سمجھ رہا ہوں اس پر مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے کہ اسے کسی پاگل پن سے روک سکوں۔ آج تم اتنی بلندیوں پر پہنچ گئے ہو، اس لیے جانا چاہتے ہو، تم میں اس بات کا احساس نہیں کہ تمھیں ان بلندیوں تک پہنچانے میں، میں نے بھی کچھ حصّہ لیا ہے۔

اختر: آپ اصرار کرتے ہیں تو سُنیے۔ جس اختر کو آپ ایک تنگ و تاریک کوٹھری سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے، وہ مصور اختر مر چکا ہے اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لیے یہ شاندار اسٹوڈیو بنایا گیا ہے، وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔

تجمل: معلوم ہوتا ہے دورہ بہت شدید ہے۔ مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہیے۔

(تجمل جانے لگتا ہے اختر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

اختر: (لہجے میں کسی قدر تحکم) ٹھہریے اور سب کچھ سُن کر جائیے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تجمل: یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہیے۔

اختر: آپ ابھی تک اِسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں حالانکہ میں بالکل نارمل ہوں۔ ابھی تک آپ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھ رہے ہیں اور اب اس کا دوسرا رُخ دیکھیے جو اتنا بھیانک اور اتنا خوفناک ہے کہ آپ کے تصوّرات کا شیش محل ابھی زمین بوس ہو جائے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمل: (اختر کو گھورتے ہوئے) معاملہ اتنی دور تک جا پہنچے گا، مجھے اس کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ اختر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت آرام کرو۔ تمھیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر: ذرا تحمل سے کام لیجیے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے، کہنے دیجیے۔

تجمل: تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو، تحمل سے کام خاک لوں!

اختر: جب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی، اُس وقت فیصلہ کیجیے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

تجمل: یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے مہمان ہو، اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی ہیں، جو شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے تحفتاً اپنے دوستوں کو دی ہیں۔ یہ سب کی سب تمھاری ہیں، تمھاری اپنی تخلیق ہیں، لیکن آج تم کہ رہے ہو، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا؟

اختر: مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اور سُنے گا تو کیا کہے گا۔ میرے لیے یہ کش مکش ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اس خلش نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمل: فریب؟ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے اختر، کاش میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمھاری اس پریشانی کی وجہ کیا ہے؟ ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے، میں کیا سمجھوں آخر؟

اختر: آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے، یہ کوئی معمّا نہیں ہے۔ سُنیے! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک خستہ اور بدنما مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے اور جو جانتے تھے، انھیں میرے متعلق صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس، قلاش اور گمنام مصوّر ہوں۔ میں نے بے شمار تصویریں بنائی تھیں مگر وہ تمام کی تمام کباڑیوں یا نیلام گھروں میں پہنچ کر کوڑیوں کے بھاؤ بِک چکی تھیں۔ زندگی اسی حالت میں گزر رہی تھی کہ اتفاقاً تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے میری تصویروں میں دلچسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بلا لیا۔ میں اپنے ہزاروں ہم پیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کدے سے نکل کر آپ کے ہاں آجاؤں تاکہ اطمینان کے ساتھ فن کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لیے یہ کمرا وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل: ان باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟

اختر: میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کتنا اثر ڈالا۔ میں سمجھنے لگا، آپ نہایت اونچے درجے کے انسان ہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایک ایسا دل دھڑک رہا ہے، جو انسانیت نواز ہے، جس میں ساری دنیا کا درد سمایا ہوا ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو بلا کر انھیں میری تصویریں دکھائیں، آپ نے بڑے بڑے اداروں کے

دفتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں، آپ نے میری شہرت کے لیے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ سچ مچ اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے، ایک فرشتہ تھے، ایک ایسی ہستی تھے، جس کی تعریف ہمارے قصّوں اور کہانیوں میں کی گئی ہے۔

تجمل: میں نہیں سمجھ سکتا۔ اس ذکر سے تمھارا مقصد کیا ہے؟

اختر: مگر تھوڑے عرصے بعد ہی ایک بھیانک خیال اپنا منحوس سایہ میرے ذہن میں ڈالنے لگا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے، وہ محض میری اپنی خوش فہمی ہے، حقیقت کچھ اور ہے۔

تجمل: کیا مطلب؟

اختر: مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ آپ کی سرپرستی تو محض ایک اشتہار ہے، آپ کی مصوّر نواز شخصیت کا۔ اس سرپرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہوا ہے۔

تجمل: کیا کہ رہے ہو تم؟

اختر: آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سوسائٹی کو بتانا چاہتے تھے، دیکھو میں کتنا اچھا ہوں، میں نے ایک غریب اور مفلس مصوّر کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اب یہ جو کچھ بنا رہا ہے محض میری سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے ورنہ یہ کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔ جس طرح بڑی بڑی دکانوں کے دروازوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوب صورت اور شفاف لباس پہنا کر انھیں الماریوں کے اندر سجا دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان حسین و جمیل مجسموں کو دیکھ کر دکانداروں کے اعلیٰ ذوق اور ان کی شان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں، اسی طرح آپ بھی اپنی امارت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لیے میری ذات اور میرے فن کو استعمال کر رہے تھے۔

تجمل: (غصّے سے) یہ جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ ہے۔

اختر: اور آپ کہ بھی کیا سکتے ہیں، مگر بلند آواز سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ آپ کے یہاں میری یہی حیثیت تھی اور جس وقت مجھے اس کا احساس ہوا، مجھے محسوس ہوا جیسے میری اہلیتوں پر برف کی تہ جم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرارہ باقی نہیں رہا۔ یہ احساس میرے لیے سُوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جگر کا خون دے دے کر میں نے فن کی جس شمع کو اب تک روشن رکھا ہے، اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو جگمگانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ایک فنکار یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا فن اپنا اصلی جوہر کھو کر کسی کے لیے محض ایک ذریعۂ شہرت بن کر رہ جائے۔ انھی دنوں مجھے ایک ہم پیشہ دوست مل گیا جو بدستور غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی اور التجا کی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سُن کر اس نے کہا، دیکھو! اگر تم آج کل تصویریں نہیں بنا سکتے تو

کوئی حرج کی بات نہیں۔ تمھارے لیے میں تصویریں بناتا رہوں گا، تم مجھے اتنے پیسے دے دیا کرو کہ میں اور میرا خاندان عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ یہ تجویز میرے لیے نا قابلِ برداشت تھی مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں روپے حاصل کرنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ روپے میں اسے دے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں۔

تجمل: ان تصویروں کو تم ....

اختر: اپنی تخلیق بنا کر پیش کر دیتا تھا۔

تجمل: (تجمل اس انداز سے اختر کو دیکھتا ہے جیسے ان الفاظ سے اسے دھچکا سا لگا ہو) تم مجھے دھوکا دیتے رہے اب تک۔

اختر: دھوکا یا کچھ اور، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ نیازی کو وقتاً فوقتاً سکّے ملتے رہے، مجھے بنی بنائی تصویریں اور آپ کو فن کی قدر افزائی اور مصوّر نوازی کے لیے سوسائٹی میں عزت و احترام۔

تجمل: میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پست سطح پر اتر چکے ہو۔

اختر: میں نے خود کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اس سطح پر اُترنے کے لیے مجبور تھا۔ نیازی نے مجھے کئی تصویریں دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے معزز لوگوں کے ڈرائنگ روموں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح مفلس نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے روٹی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب مالک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرتا، مگر میں جانتا ہوں کہ اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکوں کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دِہ واقعہ ہے، جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آج جب اس نے سنا ہوگا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر اوّل انعام کی مستحق قرار پائی ہے، تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ کیا سوچے گا؟ میں اس تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔

تجمل: تو اب تک تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی چھپاتے رہے۔ میں نے اتنی آسائشیں بے کار مہیا کی تھیں!

اختر: آپ ان کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہوا ہے۔

تجمل: اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے محسن کو جلی کٹی سناتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟

اختر: مجھے شرم کیوں آئے گی؟ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہیے جو بلندیوں پر پہنچنے کے لیے ہزاروں انسانوں کو اپنی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ جو ایک فن کار کی سر پرستی بھی کرتے ہیں تو اپنے مطلب کے لیے۔

تجمل: اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم کیا ہو؟ احسان فراموش، چور، مجرم۔

اختر: میں سب کچھ ہوں مگر تم۔ تم کیا ہو، یہ بھی تو کہو؟

تجمل: میں؟

اختر: ہاں تم۔ بتاؤ، خاموش کیوں ہو، بتاتے کیوں نہیں۔ دوسرے کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو، مگر اپنے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ بتاؤ کون ہو تم؟

رؤف: (رؤف آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔) وہ خبر بالکل درست ہے جناب۔ پہلا انعام اختر صاحب ہی کو ملا ہے۔ یہ رہا اخبار (بغل سے اخبار نکالتا ہے۔) آپ .... (دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔)

تجمل: تم جاؤ اس وقت۔

رؤف: بہتر جناب! (رؤف دروازے کی طرف جانے لگتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے۔)
اوہ یاد آ گیا۔ مسٹر اختر آپ کا کوئی واقف کار راستے میں ملا تھا۔ اس نے ایک پیغام دیا ہے آپ کے نام۔
آپ کا کوئی مصوّر دوست تھا، نیازی۔

اختر: ہاں کیا ہوا اسے، جلدی بتاؤ؟

رؤف: افسوس آج صبح اس نے خودکشی کر لی۔

اختر: خودکشی!

رؤف: جی ہاں۔ ہسپتال جانے سے پہلے مر چکا تھا۔

اختر: (تجمل سے) سُنا تم نے، ابھی پوچھ رہے تھے میں کیا ہوں، اب تو تمھیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ تم کیا ہو۔ تم قاتل ہو، یہ قتل تم نے کیا ہے۔

تجمل: (غصّے سے گرج کر) بکواس بند کرو۔

اختر: قانون تمھیں کچھ نہیں کہے گا، مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو۔ تم نے دو قتل کیے ہیں، ایک مصوّر کے فن کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور دوسرے مصوّر کی جان لے لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے اور قتل کیا ہوتا ہے؟

تجمل: نکل جاؤ یہاں سے کمینے، پاجی، احسان فراموش!

اختر: میری زبان رک نہیں سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہوں گا، دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے، اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوف ناک مجرم ہے یہ ....

تجمل: رؤف کھڑے کیوں ہو، اس پاجی کو دھکے دے دے کر نکال دو۔ لے جاؤ اسے پاگل خانے میں، پولیس کو ٹیلی فون کرو، یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔ (رؤف اختر کو دھکے دے کر باہر نکالنے لگتا ہے) اختر چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے "تم قاتل ہو، تم نے قتل کیا ہے، میں خاموش نہیں رہوں گا۔" یہ آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہے، تجمل دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا پسینا پونچھتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

(لہو اور قالین)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) تجمل نے اختر کے بارے میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا؟

(ب) اختر کا حلیہ بیان کیجیے۔

(ج) اختر کو کون تصویریں بنا کر دیتا تھا؟

(د) نیازی نے اپنی تصویریں اختر کے حوالے کیوں کیں؟

(ہ) تصویریں اختر کی نہیں ہیں۔اس انکشاف پر تجمل کا ردِّ عمل کیا تھا؟

(و) سردار تجمل حسین کی کوٹھی کا نام کیا تھا؟

(ز) تجمل کی عمر کتنی تھی؟

(ح) تجمل نے اختر کو کون سی خوشخبری سنائی؟

(ط) اختر دو سال قبل کہاں رہتا تھا؟

(ی) اختر کے نزدیک نیازی کا قاتل کون تھا؟

۲۔ میرزا ادیب نے اس ڈرامے میں کیا پیغام دیا ہے؟

۳۔ ڈراما ''لہو اور قالین'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴۔ اس ڈرامے کے کرداروں کے نام لکھیں۔

۵۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع لکھیں۔

منظر، تصویر، باغ، خبر، انعام، تکلیف

۶۔ متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) ججوں نے تمھاری تصویر کو..................کا مستحق قرار دیا ہے۔

(ب) میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لیے..................کو بھیج دیا ہے۔

(ج) تم نے ملک کے تمام..................کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے۔

(د) تمھیں مبارک باد دینے شہر کے..................آ رہے ہیں۔

(ہ) سنا ہے..................پر کبھی کبھی..................بھی پڑتے ہیں۔

(و) میرے..................کی بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔

(ز) آپ کے..................کا..................ابھی زمین بوس ہو جائے گا۔

(ح) آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے، یہ کوئی .... نہیں ہے۔

(ط) آج سے دو سال پہلے میں ایک .... گلی کے ایک خستہ اور .... مکان میں رہتا تھا۔

(ی) قانون تمھیں کچھ نہیں کہے گا، مگر .... کی نظروں میں تم .... ہو۔

۷۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

تجمل، مصور، متعجب، مستحق، اعزاز، معززین، اہتمام، سنجیدہ، معاملہ، معما

۸۔ مذکر اور مؤنث الگ الگ کریں۔

سرکار، پاجامہ، قمیص، اخبار، مصوّر، تصویر، جھونپڑی، توہین، مہمان، نمائش

۹۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
تجمل	مصوّر
بابا	سیکرٹری
میرزا ادیب	سرمایہ دار
رؤف	ڈراما نگار
اختر	نوکر

۱۰۔ درج ذیل کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

فن کار، شب بیداری، خوش خبری، اعزاز، کارنامہ، شیش محل، کش مکش، نمائش گاہ، سرپرستی، مصور نواز

ڈراما:

یہ میرزا ادیب کا ڈراما ہے۔ ڈراما جس یونانی لفظ سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں ''کر کے دکھانا۔'' ڈراما بھی ایک کہانی ہوتی ہے لیکن اِسے کرداروں کی حرکات وسکنات اور مکالموں کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ڈراما پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ پیش کرنے کی چیز ہے۔ اِس میں سٹیج، اداکاروں اور مکالموں کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ یوں تو ڈراما سٹیج کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا جاتا ہے لیکن بعض لوگوں نے ادبی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

میرزا ادیب کے کسی اور ڈرامے کا مطالعہ کیجیے۔

مکالمہ نویسی:

مکالمہ، باہمی کلام اور بات چیت کو کہتے ہیں۔ مکالمے میں ہم ایک دوسرے تک اپنے خیالات، تأثرات اور جذبات پہنچاتے ہیں۔ مکالمہ ہمیشہ کسی ایک متعیّن موضوع پر ہوتا ہے۔ مکالمہ اپنی اصل ماہیت کے اعتبار سے زبانی ہوتا ہے، تاہم اسے

تحریری شکل بھی دی جا سکتی ہے۔ مکالمے میں باہم کلام کرنے والے اشخاص کے جوہر و کردار، نقطۂ نظر، شخصیت کی گہرائی، زبان پر قدرت، مسائل کو سمجھنے کی اہلیت کا پتا چلتا ہے۔

مکالمہ فطری بات چیت ہے مگر چونکہ یہ لکھا جاتا ہے اور فرضی کرداروں کے درمیان گفتگو کو مکالمے کی شکل دی جاتی ہے، اس لیے مکالمہ ایک حد تک مصنوعی بھی ہو جاتا ہے۔ تاہم اچھا مکالمہ وہ ہے جس میں کردار اپنی ذہنی سطح، اپنے طبقاتی احساس، اپنے علم و مرتبے کے مطابق گفتگو کرتے دکھائے جائیں۔ یہ نہ ہو کہ ایک طالب علم پروفیسر کی طرح اور ایک عورت مردوں کی طرح گفتگو کرتی دکھائی جائے۔ مکالمے میں گفتگو کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ بات سے بات خود بہ خود نکلتی جائے، تاہم باتوں کو دہرانے سے گریز کرنا چاہیے۔ مکالمے کی زبان روزمرے اور محاورے کے مطابق ہو اور مکالمے کے کردار کی شخصیت کے مطابق زبان کا انتخاب کرنا چاہیے۔

مکالمے ڈرامے کی جان ہیں۔ یہ ناول اور افسانے میں بھی لکھے جاتے ہیں۔ مکالمہ نویسی کے لیے اچھے ڈراموں کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے۔

سرگرمیاں:

۱۔ بچوں کے مختلف گروپ بنا کر ان کے درمیان جھوٹ اور بناوٹ کے موضوع پر گروہی بحث کروائیں۔

۲۔ مختلف طلبہ کو مختلف کردار قرار دے کر، یہ ڈراما جماعت کے کمرے میں بلند آواز سے پڑھا جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ اسلام کی تعلیمات میں خلوصِ نیت کی بڑی اہمیت ہے۔ اعمال کی بنیاد نیتوں کو قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ اس بات کی وضاحت کی جائے کہ دکھاوے اور دنیاوی شان و شوکت کے لیے کیے جانے والے اعمال، کبھی بھی سکون کا باعث نہیں ہو سکتے۔

۳۔ طلبہ کو میرزا ادیب کی ڈراما نگاری کی چیدہ چیدہ خصوصیات سے آگاہ کریں۔

۴۔ طلبہ کو ڈرامے کے اہم ترین عنصر "تجسس" (Suspense) کے بارے میں بتایا جائے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۳ء.........۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ دِلّی میں پیدا ہوئے اور سینٹ اسٹیفنز کالج دِلّی سے بی اے کیا۔ زمانۂ طالبِ علمی میں ڈرامے اور کرکٹ کا شوق رہا۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد دکن چلے گئے اور پہلے تعلیم اور پھر عدالت کے محکموں سے وابستہ رہے۔ وہ ترقی کرتے کرتے ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے، جہاں سے ریٹائر ہوئے اور پنشن حاصل کی۔ انھوں نے حیدرآباد ہی میں وفات پائی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر سادہ اور پُر لطف ہے۔ وہ بڑے شگفتہ انداز میں، دِلّی کی خاص زبان لکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تصنّع اور بناوٹ، نام کو نہیں۔ مزاح کی چاشنی، ان کی تحریر میں خاص لُطف دیتی ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

> ”فرحت کے اسلوب کی نمایاں خوبی فقروں کا اختصار ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں سے رواں دواں عبارت کا جادو جگاتے ہیں۔ فرحت کی تحریروں میں اسلوب کی یکسانیت، معجزے کی حد تک قائم رہتی ہے۔ وہ ایک مضمون کو جس رنگ میں شروع کرتے ہیں، اسی رنگ میں انجام تک پہنچاتے ہیں۔“

مرزا فرحت اللہ بیگ ابتدا میں ”مرزا الم نشرح“ کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور عظمت اللہ خاں نے ان کی ہمت بڑھائی اور وہ اپنے اصل نام سے لکھنے لگے۔ ”نذیر احمد کی کہانی“، ”پھول والوں کی سیر“ اور ”دِلّی کا ایک یادگار مشاعرہ“ ان کے یادگار مضامین ہیں۔

ان کے مضامین ”مضامینِ فرحت“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ ”میری شاعری“ ان کے کلام کا انتخاب ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

امتحان

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو طنز و مزاح کے معنی و مفہوم سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو تعلیم و تدریس میں امتحان کی اہمیت سے روشناس کرانا۔
۳۔ طلبہ کو یہ بتانا کہ امتحان میں کامیابی کے لیے صرف ذاتی محنت اور قدرت کی مدد ہی کام آتی ہے۔
۴۔ اس بات سے روشناس کرانا کہ ناجائز ذرائع سے امتحان میں کامیابی کے حصول کے خواہش مند طلبہ کو شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

نہ ہوئی گر مرے پرچوں سے تسلّی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے۔ آخر امتحان ایسا کیا ہوتا ہے؟ دو ہی صورتیں: ''فیل یا پاس۔'' اس سال کامیاب نہ ہوئے، آئندہ سال سہی۔ میں اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو دیکھتا تھا کہ جُوں جُوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس، ان کا دماغ مختل اور ان کی صورت اتنی سی نکل آتی تھی۔ بندے پر امتحان کا نہ رتی برابر اثر پہلے تھا اور نہ اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے۔ امیدواروں کا مجمع، نئی نئی صورتیں، عجیب عجیب خیالات: یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہو سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوئے جائے، لیکن پڑھنے اور یاد کرنے کی شرط اٹھا دی جائے۔ میری سُنیے کہ دو سال میں لا کلاس کا کورس پورا کیا مگر کس طرح؟ شام کو یاروں کے ساتھ ٹہلنے نکلتا۔ واپسی کے وقت ''لا کلاس'' میں بھی جھانک آتا، منشی صاحب دوست تھے اور لکچرار صاحب پڑھانے میں مستغرق، حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیں کی ''لا کلاس'' میں شریک ہونے سے میرے کس مشغلے میں فرق آ سکتا تھا؟ والد صاحب قبلہ خوش تھے کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا ہے۔ کسی زمانے میں بڑے بڑے وکیلوں کے کان کترے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس تک تو کوئی محنت کے لیے کہہ ہی نہیں سکتا۔ بعد میں دیکھیے کون جیتا ہے اور کون مرتا ہے، لیکن زمانہ آنکھ بند کیے گزر جاتا ہے، دو سال ایسے گزر گئے جیسے ہوا۔ ''لا کلاس'' کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا والدین امتحان وکالت کی تیاری کے لیے سر ہو گئے مگر میں بھی ایک ذاتِ شریف ہوں، ایک بڑھیا اور ایک بوڑھے کو دھوکا دینا کیا بڑی بات ہے۔ میں نے تقاضا کیا کہ علیٰحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چند روز اسی حیلے سے ٹال دیے، لیکن تا کجے؟ بڑی بی نے اپنے سونے کا

کمرا خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال چلا، دروازوں میں شیشے تھے، ان پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سے سو جاتا اور صبح نو بجے اٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خوامخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے، اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا، تو کہہ دیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ لیمپ بھڑک کر چمنی سیاہ ہوگئی اور میری زیادہ محویت و محنت کا نتیجہ سمجھی گئی۔ بعض وقت والد والدہ کہتے بھی تھے کہ اتنی محنت نہ کیا کرو، لیکن میں زمانے کی ترقی کا نقشا کھینچ کر ان کا دل خوش کر دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل بھی آسان ہوگئی اور امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ میں نے گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لیے جیسا چاہیے ویسا تیار نہیں ہوں لیکن میری مسلسل حاضری لا کلاس اور شبانہ روز کی محنت نے ان کے دلوں پر سکّہ بٹھا رکھا تھا۔ وہ کب ماننے والے تھے، پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لیے ان سے کہہ دیا کہ اگر میں فیل ہو جاؤں تو اس کی ذمّے داری مجھ پر نہ ہوگی کیونکہ میں اپنے آپ کو ابھی امتحان کے قابل نہیں پاتا۔ لیکن والد صاحب مسکرا کر بولے کہ امتحان سے کیوں ڈرے جاتے ہو، جب محنت کی ہے تو شریک بھی ہو جاؤ، کامیابی و ناکامیابی خدا کے ہاتھ ہے:

مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پر ایک چھوٹا سا لکچر دے کر ثابت کر دیا کہ تدبیر کوئی چیز نہیں، تقدیر سے تمام دنیا کے کام چلتے ہیں۔

قصّہ مختصر درخواستِ شرکت دی گئی اور منظور ہوگئی اور ایک دن وہ آیا کہ ہم ہال ٹکٹ لیے ہوئے مقامِ امتحان پر پہنچ ہی گئے۔ گویا نہیں کیا تھا، لیکن دو وجہ سے کامیابی کی امید تھی: اوّل تو ''امدادِ غیبی'' دوسرے ''پرچوں کی الٹ پھیر۔'' شاید وہ حضرات جو امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوئے، اس مضمون کو نہ سمجھیں، اس لیے ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں۔ ''امدادِ غیبی'' سے مراد امیدوارانِ امتحان کی اصطلاح میں وہ مدد ہے، جو ایک کو دوسرے سے یا کسی نیک ذات نگران کار سے یا عندالمواقع کتاب سے پہنچ جاتی ہے۔ پرچوں کی الٹ پھیر گو بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن تقدیر سب کچھ آسان کر دیتی ہے۔ بعض شریف کم حیثیت ملازم ایسے بھی نکل آتے ہیں، جو با امید انعام پرچہ بدل دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے، لیکن تدبیر و تقدیر کا مسئلہ جیسا اس کارروائی میں حل ہوتا ہے، دوسری کسی صورت میں حل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں، اس لیے ان پر بھروسا کرنا نادانی ہے۔ خیر آمدم برسرِ مطلب، پونے دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ کہہ کر امتحان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک بہت خلیق اور ہنس مکھ نگرانِ کار تھے۔ مجھے جگہ نہیں ملتی تھی، میں نے ان سے کہا وہ میرے ساتھ ہو لیے۔ جگہ بتائی اور بڑی دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ میں سمجھا چلو بیڑا پار ہے، اللہ دے اور بندہ لے۔ ٹھیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا۔ میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جیسا میرے چہرے پر اطمینان تھا، شاید ہی کسی کے چہرے پر ہوگا۔ خود تو اس پرچے کے متعلق اندازہ نہ کر سکا لیکن نگرانِ کار صاحب کو یہ کہتے ضرور سنا کہ پرچہ مشکل ہے۔ میں کئی مرتبہ اوّل سے آخر تک اس کو پڑھ گیا لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ کس مضمون کا ہے۔ جوابات کی

کاپی دیکھی، اس کے آخر کی ہدایتیں پڑھیں، صفحۂ اوّل کی خانہ پُری کی اور کھڑا ہو گیا۔ گارڈ صاحب فوراً ہی آئے، میں نے ان سے کہا کہ جناب یہ پرچہ کس مضمون کا ہے؟ وہ مسکرائے، زبان سے تو کچھ نہ بولے مگر پرچے کے عنوان پر انگلی رکھ دی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ''اصولِ قانون'' کا پرچہ ہے، دل کھل گیا۔ میں نے بھی قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کر دیا، کیونکہ اصول کے لیے کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت تو ہے ہی نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ایک مقنّن ایک اصول قائم کرتا ہے، دوسرا اس کو توڑ دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز کا پابند کریں۔ میں نے اپنے برابر والے سے پوچھنے کی کوشش بھی کی، کچھ اِدھر اُدھر نگاہ بھی دوڑائی، مگر گارڈ صاحب میری حالت کو کچھ ایسا تاڑ گئے تھے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر ہی کھڑے رہتے تھے۔ ذرا میں نے اِدھر اُدھر گردن پھیری اور انھوں نے آواز دی کہ ''جناب اپنے پرچے پر نظر رکھیے۔''

جب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہو گئی تو میں نے دل میں سوچا کہ چلو ان گارڈ صاحب سے ہی پوچھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آئے میں نے دریافت کیا کہ جناب اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے؟ وہ مسکرائے اور کہا کہ ''مجھے معلوم نہیں۔'' میں نے کہا کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں، ان سے پوچھ دیجیے اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے تو ذرا اُدھر ٹہلتے ہوئے تشریف لے جایئے، میں خود پوچھ لوں گا۔ مگر وہ کب ہلنے والے تھے، قطب ہو گئے۔ ان کا مسکرانا پہلے تو اچھا معلوم ہوتا تھا، لیکن پھر آخر میں تو زہر ہو گیا۔ میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو انھی صاحب سے ہوئی ہے۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان کے گزر گئے۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ، ایسی حالت میں کہ ایک حرف بھی یاد نہ ہو، پورے چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے؟ میں تو ہر روز آدھا گھنٹا کے بعد ہی کمرے سے نکل آتا۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ والد صاحب روز گیارہ بجے سے آجاتے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے۔ اب میں جلدی باہر آجاتا تو جو رُعب میں نے دو سال کے عرصے میں قائم کیا تھا، وہ سب ہوا ہو جاتا۔ اس لیے قہرِ درویش، بر جانِ درویش، آخری وقت تک امتحان کے کمرے میں بیٹھا رہتا اور جب نیچے اترتا تو والد صاحب سے پرچے کی سختی کی ضرور شکایت کرتا۔ وہ بھی میری تشفی کے لیے ممتحن کو بہت کچھ بُرا بھلا کہتے۔ لیکن ان کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، میرا بیٹا کامیاب ضرور ہوگا۔ امتحان ختم ہوا اور امید نمبر ایک اور دو کا خون ہو گیا۔ اب ممتحنوں کے پاس کوشش کی سوجھی۔ والد صاحب ایک زبردست چٹھی سفارش کی لے کر ایک صاحب کے یہاں پہنچے۔ وہ چٹھی دیکھ کر بہت اخلاق سے ملے، آنے کی وجہ دریافت کی۔ والد نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس سال امتحان میں شریک ہوا ہے اگر آپ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ زاد ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گا۔ وہ بہت ہنسے اور دوسرے لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے، فرمانے لگے: یہ عجیب درخواست ہے، ان کا بیٹا تو امتحان دے اور کوشش میں کروں۔ بندۂ خدا اپنے لڑکے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے۔ بے چارے بڑے میاں ایسے نادم ہوئے کہ پھر کسی کے پاس نہ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد نتیجہ بھی شائع ہو گیا اور کمترین جملہ مضامین میں بدرجۂ اعلیٰ فیل ہوا۔ خبر نہیں کہ وہ کون سے بھلے مانس ممتحن تھے کہ انھوں نے دو نمبر بھی دیے، باقی نے تو صفر ہی ڈالا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا۔ نمبروں کی نقل حاصل کی اور بالآخر یہی رائے قرار پائی کہ کسی بدمعاش چپراسی نے بدل دیے ورنہ ممکن تھا کہ برابر تین

گھنٹے لکھا جاتا اور صفر ملتا۔ مجھے بھی تعجب تھا کیونکہ میں نے پرچے کچھ ایسے بُرے نہیں کیے تھے، میں نے یہ جوابات والد صاحب کو بھی سنائے، انھوں نے بہت تعریف کی، ممتحنوں کو بہت بُرا بھلا کہا۔ میری اشک شوئی کی اور فرمایا بیٹا کوئی گھبرانے کی بات نہیں، اس سال نہیں، آئندہ سال سہی۔ آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی:

سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا

خیر جو کچھ ہوا سو ہوا، ایک سال کی فرصت تو مل گئی۔

(مضامینِ فرحت)

مشق

۱۔ مختصر جواب لکھیں۔

(الف) مضمون نگار کو امتحان سے گھبرانے والوں پر ہنسی کیوں آتی ہے؟

(ب) جُوں جُوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے، مضمون نگار کے دوستوں اور ہم جماعتوں کا کیا حال ہوتا؟

(ج) مضمون نگار نے کون سا امتحان دیا تھا؟

(د) مضمون نگار نے امتحان دیا تو کیا نتیجہ نکلا؟

(ہ) مضمون نگار کے والد نے کس طرح اُسے تسلّی دی؟

۲۔ سبق ''امتحان'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ اور تراکیب کے معانی لکھیں۔

مخل، مستغرق، محویت، امدادِ غیبی، خادم زادہ، ممتحن، تشفّی، اشک شوئی، کم ترین، بدرجۂ اعلیٰ، خادم

۴۔ واحد الفاظ کی جمع لکھیں۔

امتحان، خیال، مشغلہ، وکیل، ممتحن، تدبیر، مضمون

۵۔ اِعراب لگا کر تلفّظ واضح کریں۔

حواس، مخل، مشغلہ، مستغرق، خلیق

۶۔ متن کو مدِّنظر رکھتے ہوئے درست جواب کی نشاندہی (✓) سے کریں۔

(الف) بندے پر امتحان کا اثر نہیں تھا:

(i) رتی برابر (ii) ذرا برابر

(iii) بالکل (iv) معمولی

(ب) طالب علم نے کتنے سال میں لا کلاس کا کورس پورا کیا؟

(i) چار سال (ii) دو سال

(iii) تین سال (iv) پانچ سال

(ج) لا کالج میں کون طالب علم کا دوست تھا؟

(i) لکچرار صاحب (ii) پرنسپل صاحب

(iii) منشی صاحب (iv) چوکیدار

(د) طالب علم نے کس سے پوچھا کہ یہ پرچہ کس مضمون کا ہے؟

(i) نگران صاحب سے (ii) گارڈ صاحب سے

(iii) سپرنٹنڈنٹ سے (iv) کسی طالب علم سے

(ہ) طالب علم کتنی دیر میں کمرے سے باہر نکل آتا؟

(i) ایک گھنٹے بعد (ii) آدھا گھنٹا بعد

(iii) دو گھنٹے بعد (iv) تین گھنٹے بعد

۷۔ متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) لوگ..........کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے..........پر ہنسی آتی ہے۔

(ب) والد صاحب قبلہ..........تھے کہ بیٹے کو......کا شوق ہو چلا ہے۔

(ج) کِسی زمانے میں بڑے بڑے..........کے کان کترے گا۔

(د) لیمپ روشن کرکے آرام سے..........سے سو جاتا اور..........اُٹھتا۔

(ہ) قصہ مختصر درخواست شرکت دی گئی اور..........ہو گئی۔

(و) یہاں ایک بہت......اور..........نگرانِ کار تھے۔

(ز) ایک..........ایک اصول قائم کرتا ہے، دوسرا اس کو توڑ دیتا ہے۔

(ح) والد صاحب روز..........سے آجاتے اور..........صحن میں بیٹھے رہتے۔

(ط) والد نے عرض کیا کہ..........اس سال امتحان میں شریک ہوا ہے۔

(ی) سو دن..........کے تو ایک دن..........کا۔

۸۔ متن کو مدِ نظر رکھ کر کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
فرحت اللہ بیگ	لاکلاس
فیل	مرنا
جینا	بُڑھیا
دو سال	امتحان
بڈھا	پاس
تقدیر	ناکامیابی
مشکل	منظور
کامیابی	تدبیر
درخواست	آسان

جملے کے اجزائے ترکیبی:

جملہ الفاظ کے ایسے مجموعے کا نام ہے، جس سے بات پورے طور پر سمجھ آ جائے۔ ہر جملے کے دو حصے ہوتے ہیں، جن کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس تعلق کو قواعد میں اسناد کہتے ہیں۔ جس شخص یا چیز کی نسبت یا تعلق ہو، اسے مسند اور جس کے ساتھ تعلق یا نسبت ہو اسے مسندالیہ کہتے ہیں۔ مسندالیہ ہمیشہ اسم (نام) ہوتا ہے۔ مسند کبھی اسم اور کبھی فعل ہوتا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

(الف) انور دوڑا۔

(ب) فرید عقل مند ہے۔

پہلے جملے میں مسندالیہ (انور) اسم ہے جب کہ مسند (دوڑا) فعل۔ دوسرے جملے میں مسندالیہ (فرید) اسم ہے اور مسند (عقل مند) بھی اسم ہے۔

جملہ اسمیہ اور فعلیہ میں امتیاز کرنا

جملہ اسمیہ: ایسا جملہ جس میں مسند اور مسندالیہ دونوں اسم ہوں، جملہ اسمیہ کہلاتا ہے جیسے:

(الف) اکبر بہادر ہے۔

(ب) زید بزدل تھا۔

(ج) لڑکے چالاک ہیں۔

ان تین جملوں میں مسندالیہ (اکبر، زید اور لڑکے) اسم ہیں۔ اسی طرح مسند (بہادر، بزدل، چالاک) بھی اسم ہیں۔

اسمیہ جملے کے مندرجہ ذیل تین اجزا ہوتے ہیں:

مسندالیہ: اسے مبتدا بھی کہتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں اکبر، زید اور لڑکے مسندالیہ ہیں۔

مسند: اسے خبر بھی کہتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں بہادر، بزدل اور چالاک مسند ہیں۔

فعلِ ناقص: فعل ناقص سے زمانے کا تعیّن ہوتا ہے۔ اوپر کی مثالوں میں ہے، تھا اور ہیں فعلِ ناقص ہیں۔

جملہ فعلیہ: ایسا جملہ جس میں مسندالیہ اسم اور مسند فعل ہو۔ جیسے:

(الف) وہ پڑھتا تھا۔

(ب) عائشہ روتی ہے۔

(ج) میں کھانا کھاتا ہوں۔

ان تین جملوں میں مسندالیہ (وہ، عائشہ اور میں) اسم ہیں جب کہ مسند (پڑھتا، روتی اور کھاتا) افعال ہیں۔ فعلیہ جملے کے اجزا درجِ ذیل ہیں:

مسندالیہ: اسے فاعل کہتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں وہ، عائشہ اور میں مسندالیہ ہیں۔

مسند: فعلیہ جملے میں اسے فعل کہتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں پڑھتا، روتی، کھانا مسند ہیں۔

مفعول: جس پر کام کیا جائے وہ مفعول کہلاتا ہے جیسے: وہ ہاکی کھیلتا ہے میں ہاکی۔

مبتدا اور خبر کا فرق اور آگاہی:

اسمیہ جملے کے مسندالیہ کو مبتدا کہتے ہیں جب کہ مسند کو خبر۔ مثالیں دیکھیں۔

(الف) عادل ذہین تھا۔

(ب) اسلم نالائق ہے۔

(ج) پتھر سخت ہے۔

(د) لکڑی مضبوط ہے۔

ان مثالوں میں عادل، اسلم، پتھر اور لکڑی مبتدا ہیں۔ جب کہ ذہین، نالائق، سخت اور مضبوط (مُسند) خبر۔

سرگرمیاں:

۱۔ بچوں سے کہیں کہ وہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی کوئی اور شگفتہ تحریر پڑھیں اور اس کا خلاصہ اپنی کاپی میں لکھیں۔

۲۔ باری باری ہر بچے سے کہیں کہ انھیں اس تحریر میں جو بات سب سے اچھی لگی ہے، اسے جماعت کے کمرے میں اپنے الفاظ میں بتائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتائیں کہ مزاحیہ تحریر لکھنے والے ادیب کو مزاح نگار کہتے ہیں۔

۲۔ طلبہ کو بتائیں کہ مزاحیہ تحریر میں شگفتگی پائی جاتی ہے جبکہ طنزیہ تحریر میں طنز کی شدت کی وجہ سے چُبھن کا احساس ہوتا ہے۔

۳۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا تعارف خصوصاً ان کی خاکہ نگاری کے حوالے سے کراتے ہوئے ان کے معروف مضامین کا ذکر کیا جائے۔

۴۔ امتحان کے موضوع کے حوالے سے اس قسم کے دیگر مضامین کا تعارف کرایا جائے مثلاً منشی پریم چند کا ''بڑے بھائی صاحب'' اور پطرس کا ''ہاسٹل میں پڑنا'' اور ''سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی'' وغیرہ۔

۵۔ کامیابی کے لیے محنت و مشقت کی تلقین کی جائے اور ''محنت کی عظمت'' سے متعلق کوئی واقعہ طلبہ کو سُنایا جائے۔

۶۔ سبق میں جو شعر اور مصرعے آئے ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔

شفیق الرّحمان

(۱۹۲۰ء.........۲۰۰۰ء)

اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور مزاح نگار شفیق الرّحمان ۱۹۲۰ء میں ضلع جالندھر میں ''کلانور'' کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی ایس کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ اپنی قابلیت اور میڈیکل کے امتحان میں نمایاں پوزیشن کی وجہ سے ایک سال کے اندر ہی انھیں فوج میں انڈین آرمی میڈیکل سروس میں لے لیا گیا۔ پاکستان بن گیا تو وہ پاکستان آرمی کا حصّہ بن گئے اور میجر جنرل کے عہدے تک ترقّی کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں ان کا تقرر اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین کی حیثیت سے ہوگیا، جہاں انھوں نے چھے سال یعنی ۱۹۸۶ء تک علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔

شفیق الرّحمان کے مزاح کا انداز بہت ہلکا پھلکا اور نہایت شائستہ ہے۔ اُن کے ہاں نہ تو الفاظ کی بازی گری سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نظر آتی ہے اور نہ ہی محض مزاح پیدا کرنے کی غرض سے ایک باوقار مقام سے نیچے اترنے کا رجحان ملتا ہے۔ ان کی تحریریں حسِ مزاح رکھنے اور مزاح کے تقاضوں کو سمجھنے والوں میں بہت مقبول ہوئیں۔

۱۹۴۲ء میں آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کرنیں'' شائع ہوا۔ آپ کے دیگر مجموعوں میں ''شگوفے''، ''مدّو جزر''، ''حماقتیں''، ''مزید حماقتیں'' اور ''دجلہ'' وغیرہ زیادہ مشہور ہوئے۔

شفیق الرّحمان

ملکی پرندے اور دوسرے جانور

مقاصد تدریس

۱۔ مزاحیہ ادب کے معنی و مفہوم سے آگاہ کرتے ہوئے، طلبہ کو شفیق الرّحمان کے مزاحیہ اسلوب سے متعارف کرانا۔

۲۔ طلبہ کو بتانا کہ مزاحیہ نثر پارہ کسی بھی صنفِ ادب میں لکھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ایک صنف مخصوص نہیں۔

۳۔ تمثیل نگاری اور پیروڈی یعنی نقلِ مضحک سے روشناس کرانا۔

۴۔ طلبہ کو بتانا کہ پرندے اور جانور کس طرح اپنی خصوصیات کی وجہ سے علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

کوّا

کوّا، گرامر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔

کوّا صبح صبح موڈ خراب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ایسا موڈ جو ویسے بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ وہ کائیں کائیں کرتا ہے، کائیں کے کیا معنی ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔

کوّے کالے ہوتے ہیں، برفانی علاقوں میں سفید یا سفیدی مائل کوّا نہیں پایا جاتا۔ کوّا سیاہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ پہاڑی کوّا ڈیڑھ فٹ لمبا اور وزنی ہوتا ہے۔ میدان کے باشندے اس سے کہیں چھوٹے اور مختصر کوّے پر قانع ہیں۔ کوّے خوبصورت نہیں ہوتے لیکن پہاڑی کوّا تو باقاعدہ بدنما ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ معمولی کوّے سے حجم میں زیادہ ہوتا ہے۔

کوّے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا، اس قابل نہیں ہوتیں کہ انھیں دیکھا جائے۔ کوّا بے چین رہتا ہے اور جگہ جگہ اُڑ کر جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے، چنانچہ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کون نہیں چاہتا؟

کوّا باورچی خانے کے پاس بہت مسرور رہتا ہے۔ ہر لحظے کے بعد کچھ اُٹھا کر کسی اور کے لیے کہیں پھینک آتا ہے اور درخت پر بیٹھ کر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی حسین ہے۔ کہیں بندوق چلے تو کوّے اسے ذاتی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آجاتے ہیں۔ اس قدر شور مچتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا رہتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو کوّے نہاتے ہیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ کوّا سوچ بچار کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زیادہ فکر کرنا اعصابی بنا دیتا ہے۔ کوّے سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔ کوّا بڑی سنجیدگی سے اُڑتا ہے،

بالکل چونچ کی سیدھ میں۔ کوّے اُڑ رہے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شرط لگا کر اُڑ رہے ہیں۔ کوّے فکرِ معاش میں دُور دُور نکل جاتے ہیں لیکن کبھی کھوئے نہیں جاتے۔ شام کے وقت کوئی دس ہزار کوّا کہیں سے واپس آ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلط کوّے ہوں۔ اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو یہ مت بُھولیے کہ کوّے بھی آپ سے نالاں ہیں۔

بُلبل

بُلبل ایک روایتی پرندہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ سوائے وہاں کے جہاں اسے ہونا چاہیے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ نے چڑیا گھر میں یا باہر بُلبل دیکھی ہے تو یقیناً کچھ اور دیکھ لیا ہے۔ ہم ہر خوش گُلو پرندے کو بُلبل سمجھتے ہیں، قصور ہمارا نہیں ہمارے ادب کا ہے۔ شاعروں نے نہ بُلبل دیکھی ہے نہ اسے سُنا ہے، کیونکہ اصلی بُلبل اس ملک میں نہیں پائی جاتی۔ سُنا ہے کہ کوہِ ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں بُلبل ملتی ہے لیکن کوہِ ہمالیہ کے دامن میں شاعر نہیں ہوتے۔

عام طور پر بُلبل کو آہ وزاری کی دعوت دی جاتی ہے اور رونے پیٹنے کے لیے اُکسایا جاتا ہے۔ بُلبل کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔ ویسے بُلبل ہونا کافی مضحکہ خیز ہوتا ہوگا۔ بُلبل اور گلاب کے پھول کی افواہ کسی شاعر نے اُڑائی تھی جس نے رات گئے گلاب کی ٹہنی پر بُلبل کو نالہ وشیون کرتے دیکھا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ پرندہ بُلبل ہے اور وہ چیز نالہ وشیون۔ رات کو عینک کے بغیر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ بُلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے، یعنی اگر پروں کو نکال دیا جائے تو کچھ زیادہ بُلبل نہیں بچتی۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بُلبل کے گانے کی وجہ اس کی غمگین خانگی زندگی ہے، جس کی وجہ یہ ہر وقت کا گانا ہے۔ دراصل بُلبل ہمیں محظوظ کرنے کے لیے ہرگز نہیں گاتی، اُسے اپنے فکر ہی نہیں چھوڑتے۔ بُلبل پکے راگ گاتی ہے یا کچے؟ بہرحال اس سلسلے میں وہ بہت سے موسیقاروں سے بہتر ہے۔ ایک تو وہ گھنٹے بھر کا الاپ نہیں لیتی، بے سُری ہو جائے تو بہانے نہیں کرتی کہ ساز والے نکمّے ہیں۔ آج گلا خراب ہے، آپ تنگ آ جائیں تو اُسے خاموش کرا سکتے ہیں...... اور کیا چاہیے۔

جیسے گرمیوں میں لوگ پہاڑ پر چلے جاتے ہیں، اسی طرح پرندے بھی موسم کے لحاظ سے نقلِ وطن کرتے ہیں۔ بُلبل کبھی سفر نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ ہمارے ادب کو دیکھتے ہوئے بھی، بُلبل نے اگر اس ملک کا رُخ کیا، تو نتائج کی ذمّے دار خود ہوگی۔

بھینس

بھینس موٹی اور خوش طبع ہوتی ہے۔

بھینسوں کی قسمیں نہیں ہوتیں، وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بھینس کا وجود بہت سے انسانوں کے لیے باعثِ مسرّت ہے۔

بھینس کا ہم عصر چوپایہ، گائے دنیا بھر میں موجود ہے لیکن بھینس کا فخر صرف ہمیں ہی نصیب ہے۔ تبّت میں گائے کے وزن پر سُرا گائے ہوتی ہے، سُرا بھینس کہیں نہیں ہوتی۔ بھینس کے بچے شکل صورت میں ننھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں، لہٰذا فریقین

ایک دوسرے پر تنقید نہیں کر سکتے۔

بھینس سے ہماری محبت بہت پرانی ہے۔ بھینس ہمارے بغیر رہ لے لیکن ہم بھینس کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتے۔ آج کل یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں کو کوٹھی ملتی ہے تو ایسی، جس میں گیراج تک نہیں ہوتا، جہاں بھینس باندھی جا سکے۔ کئی بھینسیں اتنی بھدّی نہیں ہوتیں، مگر کچھ ہوتی ہی ہیں۔ دُور سے یہ پتا چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ بھینس اِس طرف آ رہی ہے یا اُس طرف جا رہی ہے۔ رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر، والا شعر یاد آ جاتا ہے۔

بھینس اگر ورزش کرتی اور غذا کا خیال رکھتی تو شاید چھریری ہو سکتی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض لوگ مکمل احتیاط کرنے پر بھی موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بھینس کا مشغلہ جگالی کرنا ہے یا تالاب میں لیٹے رہنا۔ وہ اکثر نیم باز آنکھوں سے اُفق کو تکتی رہتی ہے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچتی، اگر بھینس سوچ سکتی تو رونا کس بات کا تھا۔ بھینس کا حافظہ کمزور ہے، اسے کل کی بات آج یاد نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے وہ انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔

بھینسے کو بالکل نکمّا سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہل میں جوتنے کی سکیم ناکامیاب ثابت ہوئی، کیونکہ وہ دائمی طور پر تھکا ہوا اور ازلی سُست ہے۔ اس نے بچپن میں بھینس کا دودھ پیا تھا۔ بھینس کے سامنے بین بجائی جائے تو نتیجہ تسلی بخش نہیں نکلتا، بھینس کو بین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اُلّو

اُلّو بُردبار اور دانشمند ہے لیکن پھر اُلّو ہے۔

وہ کھنڈروں میں رہتا ہے لیکن کھنڈر بننے کی وجوہات دوسری ہیں۔ اُلّو کا ذکر پرانے بادشاہوں نے اپنے روزنامچوں میں اکثر کیا ہے لیکن اس سے اُلّو کی پوزیشن بہتر نہیں ہو سکی۔ اُلّو کی بیس قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں پانچ چھے قسمیں کافی تھیں۔ ویسے اُلّوؤں کی عادتیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں، ایک اُلّو کو دیکھ لینا تمام اُلّوؤں کو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔ اُلّو کو وہی پسند کر سکتا ہے، جو فطرت کا ضرورت سے زیادہ مدّاح ہو۔ روزمرہ کے اُلّو کو بوم کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑے کو چُغد، چغد سے بڑا اُلّو ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔

دن بھر اُلّو آرام کرتا ہے اور رات بھر ہُو ہُو کرتا ہے۔ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ آپ کا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اُلّو تُو ہی تُو کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ ان خود پسندوں سے ہزار درجہ بہتر ہے، جو ہر وقت مَیں ہی مَیں کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ شوخ اور باتونی پرندوں میں اُلّو کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ وہ چُپ چاپ رہتا ہے اور غالباً حِسِ مزاح سے محروم ہے۔ بہت سے لوگ محض اس لیے ذی فہم سمجھے جاتے ہیں، کہ وہ کبھی نہیں مسکراتے۔

مادہ، ننھے اُلّوؤں کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے مگر جونہی وہ ذرا بڑے ہوئے اور ان کی شکل اپنے ابّا سے ملنے لگی، انھیں باہر نکال دیتی ہے۔ اُلّو کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب بے سُود ہے۔ اُلّو اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اچھے تو وہ ہوتے ہیں، جو دُور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُلّوؤں کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولیے کہ انھوں نے اُلّو بننے کی التجا تھوڑا ہی کی تھی۔

بلّی

بلّیوں کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جو لوگ بلّیوں کی قسمیں گنتے رہتے ہیں، ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بلّیاں پالنے والوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ بلّی انھیں خواہ مخواہ چاہتی ہے، اس لیے نہیں کہ وہ بلّی کے قیام و طعام کا بندوبست کرتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔ بلّی دوسرے کا نکتۂ نظر نہیں سمجھتی۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ہم دنیا میں دوسروں کی مدد کرنے آئے ہیں، تو اس کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

سال بھر میں بلّی سِدھائی جا سکتی ہے، مگر سال بھر کی مشقّت کا نتیجہ صرف ایک سدھائی ہوئی بلّی ہوگا۔ جہاں بقیہ چوپائے، دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہیں، وہاں بلّی دودھ پینے والے جانوروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر غلطی سے دودھ کُھلا رہ جائے تو آپ کی سدھائی ہوئی بلّی پی جائے گی۔ اگر دودھ کو بند کر کے قفل لگا دیا جائے تب بھی پی جائے گی، کیونکر؟ یہ ایک راز ہے جو بلّیوں تک محدود ہے۔ بلیاں آپس میں لڑتی ہیں تو ناخنوں سے ایک دُوسری کا مُنھ نوچ لیتی ہیں اور مہینوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں۔ بلّی اور کتے کی رقابت مشہور ہے۔ بلّی برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان کا کوئی وفادار دوست ہو۔ بلّی میں برداشت بہت کم ہوتی ہے۔

چند بلّیاں گھر میں سارے چوہوں کو ختم کر سکتی ہیں۔ چوہے تو رفع ہو جائیں گے مگر بلّیاں رہ جائیں گی۔ بلّیاں دن بھر میک اپ کرتی رہتی ہیں، ان کی جِلد پر طرح طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں۔ موٹی بلّیاں اپنے جسم پر لمبائی میں سیدھی دھاریاں بنا لیں تو ان کا موٹاپا چُھپ سکتا ہے۔ وہ چھریری اور کیوٹ معلوم ہوں گی۔

بلّیاں دوپہر کو سو جاتی ہیں۔ وہ رات تک انتظار نہیں کر سکتیں۔ بعض اوقات بظاہر سوئی ہوئی بلّی اِدھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس سے باز پرس کی جائے تو خفا ہو جاتی ہے۔ بلّی کی جگہ کوئی بھی ہو خفا ہو جائے گا۔ ایک ہی گھر میں سالہا سال گزارنے کے باوجود انسان اور بلّی اجنبی رہتے ہیں۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔

(مزید حماقتیں)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) کوّا اگرامر میں ہمیشہ کیا استعمال ہوتا ہے؟
(ب) پہاڑی کوا کتنا لمبا ہوتا ہے؟
(ج) بندوق چلنے تو کوّے کیا کرتے ہیں؟
(د) ہم ہر خوش گلو پرندے کو بُلبل سمجھتے ہیں۔ اِس میں قصور کس کا ہے؟
(ہ) بُلبل کے گانے کی کیا وجہ ہے؟
(و) بُلبل بہت سے موسیقاروں سے کیوں بہتر ہے؟
(ز) بھینس کا مشغلہ کیا ہے؟
(ح) بھینس کس لحاظ سے انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے؟
(ط) اُلّو کی کتنی قسمیں بتائی جاتی ہیں؟
(ی) اُلّو کو کون پسند کر سکتا ہے؟
(س) اُلّو کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی کیوں نہیں؟
(ص) بلّی کتنے عرصے میں سِدھائی جاسکتی ہے؟

۲۔ متن کو مدِّ نظر رکھ کر درست جملوں پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(الف) کوّے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔
(ب) کوّا باورچی خانے کے پاس بہت اُداس رہتا ہے۔
(ج) ہم ہر خوش گلو پرندے کو بُلبل سمجھتے ہیں۔
(د) اُلّو شہروں میں رہتا ہے۔
(ہ) بلّی اور کتے کی رقابت مشہور ہے۔

۳۔ دیے گئے الفاظ میں سے موزوں الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) کوّا اگرامر میں ہمیشہ............استعمال ہوتا ہے۔ (غلط، زیادہ، مذکر، مؤنث)
(ب) کوّا باورچی خانے کے پاس بہت............رہتا ہے۔ (ناخوش، اداس، خوف زدہ، مسرور)
(ج) کوّا............نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ (سمجھ، ہنس، دوڑ، گا)
(د) بُلبل ایک............پرندہ ہے۔ (پالتو، گھریلو، روایتی، عاشق مزاج)

(ہ) ....کی قسمیں نہیں ہوتیں، وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ (بلی، بھینس، چڑیا، بلبل)

(و) بھینس کے......شکل صورت میں ننھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں۔ (پاؤں، سِنگ، بال، بچے)

(ز) اُلّو کی............قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ (بیس، تیس، چالیس، چند)

(ح) بلبلوں کی............قسمیں بتائی گئی ہیں۔ (ان گنت، کئی، بہت کم، نایاب)

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

صبح، سیاہ، تیز، اصلی، پکّا، خراب، محبت، روشن

۵۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

مذکر، مختصر، حجم، مسرور، حفظانِ صحت، خوش گلو، مضحکہ خیز، نالہ وشیون، نقل وطن، روزمرہ

۶۔ مذکر اور مؤنث الفاظ الگ الگ کریں۔

نظر، زندگی، باورچی خانہ، بلبل، گلاب، اُلّو، راگ، آہ وزاری، مصلحت، قیاس

۷۔ مصنف نے الّو کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے اختصار کے ساتھ بیان کریں۔

۸۔ سبق کا عنوان، مصنف کا نام اور اقتباس کے موقع محل کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح کریں۔

بلبل پکے راگ گاتی ہے یا کچے؟............آپ تنگ آجائیں تو اُسے خاموش کرا سکتے ہیں۔

مرکبِ ناقص اور مرکبِ تام میں فرق:

دو یا دو سے زیادہ لفظوں کے مجموعے کو مرکب کہتے ہیں۔ مرکب کی دو بڑی قسمیں ہیں:

(الف) مرکبِ ناقص۔

(ب) مرکبِ تام۔

مرکبِ ناقص: دو یا دو سے زیادہ لفظوں کا ایسا مجموعہ جو پورا مفہوم ادا نہ کرے اور سُننے والے پر اُس کا مطلب واضح نہ ہو۔

مثالیں دیکھیے:

(الف) میرا بھائی۔

(ب) کرسی پر۔

(ج) چار آم۔

(د) مضبوط دیوار۔

(ہ) قیمتی گھڑی وغیرہ۔

مرکبِ تام: دو یا دو سے زیادہ لفظوں کا ایسا مجموعہ جو پورا مفہوم ادا کرے اور سُننے والے پر اُس کا مطلب اچھی طرح واضح ہو۔

مرکبِ تام کو جملہ بھی کہتے ہیں۔ مثالیں دیکھیے:

(الف) میرا بھائی بیمار ہے۔

(ب) وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔

(ج) میں نے چار آم خریدے۔

(د) یہ کرسی بڑی مضبوط ہے۔

(ہ) اسلم نے ایک قیمتی گھڑی چُرائی۔

سرگرمیاں:

۱۔ مصنّف شفیق الرّحمان کا کوئی اور مزاحیہ مضمون اپنے اُستاد سے پوچھ کر پڑھیں۔

۲۔ بچوں کو علامہ اقبالؒ کی وہ سبق آموز نظمیں ضرور پڑھائی اور یاد کرائی جائیں، جن میں پرندوں اور جانوروں کا ذکر ہے۔ مثلاً ''ہمدردی''، ''ایک مکڑا اور مکھی''، ''ایک پہاڑ اور گلہری'' اور ''ایک گائے اور بکری'' وغیرہ۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو بتائیں کہ مزاحیہ ادب، اپنے ظاہری رویّوں میں سنجیدہ ادب سے بالکل مختلف ہوتا ہے، لیکن ہر دو طرح کے ادب کا مقصد، معاشرے کی اصلاح ہوتا ہے۔

۲۔ اس بات کی وضاحت کی جائے کہ مزاح کے لیے کوئی صنف مخصوص نہیں ہے۔ اُردو ادب میں مضامین، سفرنامے، ڈرامے اور انشائیے وغیرہ کی صورت میں مزاحیہ ادب کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

۳۔ جن جانوروں اور پرندوں کا ذکر سبق میں موجود ہے، سبق پڑھانے سے قبل اُن کا عام تعارف کرایا جائے۔

۴۔ جانوروں اور پرندوں کی جو خصوصیات مصنّف نے بیان کی ہیں اور پھر اُن کا ذکر جس علامتی انداز میں کیا ہے، اس کی وضاحت کی جائے۔

کرنل محمد خان

(۱۹۱۰ء.........۱۹۹۹ء)

اُردو کے ممتاز مزاح نگار کرنل محمد خان چکوال میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں میں حاصل کی۔میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔اسی دوران میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی چنانچہ ۱۹۴۰ء میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ کمیشن حاصل کیا۔قیامِ پاکستان کے بعد دفاعِ پاکستان میں حصہ لیا۔۱۹۶۵ء میں ''رَن کچھ'' کے محاذ پر نمایاں کارنامے انجام دیے۔کرنل کے عہدے پر پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور مستقل طور پر راولپنڈی میں سکونت اختیار کرلی۔

کرنل محمد خان کا طرزِ تحریر سادہ اور دلچسپ ہے۔اُن کی تحریروں کا اصل حُسن سادگی اور خلوص ہے۔وہ بیتے ہوئے واقعات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اُن میں چھپی ہوئی ظرافت دل میں گھر کرجاتی ہے۔مزاح کے ساتھ ساتھ وہ انسانی کمزوریوں، جھوٹ، تصنّع اور بناوٹ کے رویوں پر طنز کرتے بھی نظر آتے ہیں۔انھوں نے کئی موضوعات پر بڑے گراں قدر اور اہمیت کے حامل مزاحیہ مضامین لکھے۔ان کے ہاں مزاح نگاری کا ایک سُلجھا ہوا انداز نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں پھکڑ پن یا سوقیانہ پن کا گمان تک نہیں ہوتا۔سادگی، معنی آفرینی، باوقار طنز و مزاح ان کی تحریروں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

اُن کی تصانیف میں ''بجنگ آمد''، ''بسلامت روی'' اور ''بزم آرائیاں'' شامل ہیں۔

کرنل محمد خان

قدرِ ایاز

مقاصد تدریس

۱۔ طلبہ کو کرنل محمد خان کے واقعاتی اُسلوبِ مزاح سے آگاہ کرنا۔

۲۔ دیہات اور دیہاتیوں کی سادگی اور اُن کے خلوص سے متعارف کرانا۔

۳۔ طلبہ کو یہ بتانا کہ انسان کی قدر و قیمت اُس کے خلوص، محنت اور اصلیت پر منحصر ہے۔

کرنیلوں کو رہائش کے خاصے عمدہ سی کلاس بنگلے ملتے ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے ایک ایسا بنگلا مل گیا، جو اپنی کلاس میں بھی انتخاب تھا، یعنی مجھے کرنیلوں میں وہ امتیاز حاصل نہ تھا جو میرے بنگلے کو بنگلوں میں تھا۔ بوڑھے بیَروں سے روایت تھی کہ ولسن روڈ کا یہ لاشریک بنگلا ولسن صاحب نے خاص طور پر اپنے لیے بنوایا تھا۔

یہ بنگلا کم و بیش دو ایکڑ قطعہ زمین میں واقع تھا، یعنی قسّامِ ازل نے ہی اسے خاصا شاہانہ طول و عرض بخشا تھا۔ عمارت کے سامنے وسیع چمن تھا جس کے حاشیے پر مہندی کی گہری سبز باڑ کے سر پر، نیزوں اونچے سرو اور سفیدے کے پیڑ لہلہاتے تھے۔ چمن میں جا بجا سرخ و سپید گلاب کے پودے تھے۔ الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویے سے امیرانہ تھا۔ مقابلے میں ہمارے اثاثے کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے تاہم اپنے مکان کی شان کے پیشِ نظر ہم نے جُوں تُوں کر کے ہر کمرے کے لیے ایک قالین یا دری پیدا کرلی۔ اگرچہ اس کارِ خیر کا بیشتر اجر مقامی کباڑیے کو ملا۔ علاوہ ازیں مناسب فرنیچر بھی حاصل کرلیا۔

سلیم میاں جو ابھی ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئے تھے، دوسرے کرنیل زادوں کی طرح اور ان کے ہمراہ بے فکری سے بیڈمنٹن کھیلتے اور سرِ شام ہی دوستوں کے ساتھ ٹیلی وژن کے سامنے جم جاتے۔ کیا مجال جو کوئی غیر اس مشاہدے میں مخل یا شریک ہو، سوائے اس کے کہ ہمارا بوڑھا ملازم علی بخش ان کی تواضع کے لیے کمرے میں خاموشی سے داخل اور خارج ہوتا رہتا۔ علی بخش کو یوں بھی سلیم سے اُنس تھا کہ اسی کے ہاتھوں میں پلا تھا۔

ایک دن میں اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ علی بخش خلافِ معمول رونی صورت بنائے داخل ہوا۔ وجہِ گرانی پوچھی تو کہنے لگے:

''سلیم میاں نے ڈانٹا ہے۔ کہتے ہیں بدتمیز ہو، گنوار ہو، دیہاتی ہو۔'' میں نے ان ارشادات کی شانِ نزول پوچھی، تو بولا:

''کل سلیم میاں کی غیر حاضری میں ان کے ایک دوست امجد صاحب آئے اور باہر برآمدے ہی میں آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے

ان کے کہنے پر انھیں ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔کافی دیر سلیم صاحب کا انتظار کرتے رہے لیکن آخر مایوس ہو کر چل دیے۔ بعد میں سلیم صاحب کو بتایا تو مجھ پر برس پڑے۔ کہنے لگے، انھیں گول کمرے میں صوفے پر کیوں نہ بٹھایا؟ ریفریجریٹر سے نکال کر کوکا کولا کیوں نہ پیش کیا؟ اب امجد سمجھے گا کہ ان لوگوں کو تو اصنع کا سلیقہ نہیں، دیہاتی ہیں، جنگلی ہیں اور پھر جو منھ میں آیا کہہ دیا۔"

علی بخش کی داستانِ غم ختم ہوئی تو سلیم میاں بھی آ گئے۔علی بخش کے چہرے پر شکایت لکھی ہوئی دیکھی تو اپنے دل پر لکھی ہوئی شکایت بیان کرنے لگے۔ہم نے سکون سے یہ قصہ سنا۔طرفین کے بیانوں سے واضح تھا کہ تنازع بہت خفیف ہے اور یہ کہ دو طرفہ طوفان کا حدود اربعہ ایک چائے کی پیالی میں سما سکتا ہے۔علی بخش اس لیے ناخوش تھا کہ اسے دیہاتی کہا گیا تھا اور سلیم میاں اس بات پر برہم تھے کہ علی بخش کی غلطی کی وجہ سے امجد نے انھیں دیہاتی سمجھا ہوگا۔ ہمارے نزدیک دیہاتی ہونا یا سمجھا جانا ایسی ناقابلِ برداشت قباحت نہ تھی، چنانچہ ہم نے ہنسی ہنسی میں دیہاتی پن کے فضائل بیان کرنا شروع کیے اور اس بلاغت کے ساتھ کہ سلیم اور علی بخش دونوں مسکرا دیے اور باہم راضی ہو گئے۔ باتوں باتوں میں ہم انھیں ایک دیہاتی کا قصہ سنانے لگے:

ایک تھا لڑکا جو اپنے گاؤں سے پرائمری پاس کرنے کے بعد شہر کے ہائی سکول میں جا داخل ہوا۔اپنے گاؤں میں تو وہ چھوٹا موٹا چودھری یا چودھری کا بیٹا تھا، لیکن تھا ٹھیٹھ دیہاتی۔ پہلے دن کلاس میں گیا، تو ننگے سر پر صافہ باندھ رکھا تھا۔ بدن پر کُرتا اور تہمد اور پاؤں میں پوٹھوہاری جوتا۔ ماسٹر جی نے شلوار پہننے کو کہا، تو دھیمی آواز میں بولا: "اوخدا، سُتھن تے کڑیاں پاؤندیاں نیں[1]۔"

سلیم میاں یہ سن کر کھلکھلا اٹھے اور بولے:

"سچ مچ پکا پینڈو تھا............ مگر ابا جان! وہ پتلون کیوں نہیں پہنتا تھا؟"

میں نے کہا: "بیٹا! یہ آج سے چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ان دنوں اگر ماسٹر جی خود بھی پتلون پہن لیتے تو شہر کے کتے انھیں ولایت پہنچا آتے۔"

سلیم میری بات پوری طرح سمجھے بغیر ہنس دیے۔ بوڑھا علی بخش پوری طرح سمجھ کر مسکرایا۔ہم نے کہانی جاری رکھی: ان دنوں پتلون پوش خال خال ہی نظر آتے تھے۔ مثلاً سارے سکول میں ایک سیکنڈ ماسٹر صاحب تھے جو سوٹ پہنتے تھے۔لڑکے انھیں جنٹل مین کہا کرتے تھے۔لاہور میں تعلیم پائی تھی۔ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ہر فقرے میں دو تین لفظ انگریزی کے بولتے تھے اور لڑکے رشک سے مرنے لگتے تھے۔آدمی خوش مزاج تھے۔ ہاکی کے کھلاڑی تھے اور شکار کے شوقین۔ ایک دفعہ دسمبر میں شکار کرتے کرتے اسی دیہاتی لڑکے کے گاؤں جا نکلے۔ رات ہو رہی تھی۔ آپ نے اسی کے ہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے دروازے پر جا دستک دی۔لڑکے نے اچانک ماسٹر جی کو گھر کے دروازے پر دیکھا تو ایک لمحے کے لیے چکرا سا گیا۔ ماسٹر صاحب نے کئی دفعہ مذاق میں کہا تو تھا کہ ہم ایک دن چھوٹے چودھری کے مہمان بنیں گے............ ماسٹر جی اسے چھوٹا چودھری بھی مذاقاً ہی

---

[1] اوخدایا! شلوار تو لڑکیاں پہنتی ہیں۔

کہتے تھے۔لیکن چودھری کو توقع تھی کی ماسٹر جی مذاق کو مذاق کی حد تک ہی رکھیں گے،مگر آج وہ حد پھلانگ کر اس کے رُوبرو آ کھڑے ہوئے تو چھوٹے چودھری کو میزبانی کے بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ نہیں کہ چھوٹا چودھری یا اس کے گھر والے مہمان نواز نہ تھے۔انھیں صرف اس بات کا یقین نہیں تھا کہ ان کی مہمان نوازی ماسٹر جی کو موافق بھی آئے گی یا نہیں۔ بہر حال انھوں نے اپنی تواضع کی ابتدا کی۔چھوٹا چودھری اور اس کے بڑے بھائی ماسٹر جی کو بصد تعظیم اپنی چوپال میں لے گئے۔ چوپال کے دو حصے تھے۔ایک میں گھوڑی بندھی تھی اور دوسری کے عین مرکز میں آتش دان تھا،جس کی آگ کے شعلے اور دھواں بیک وقت بلند ہو کر چوپال میں روشنی اور تاریکی پھیلا رہے تھے۔آتش دان کے اردگرد خشک گھاس کا نرم اور گرم فرش تھا، جسے مقامی بولی میں ''ستھر'' کہتے تھے۔گاؤں کے بیس بائیس آدمی ''ستھر'' پر بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے۔ ماسٹر جی داخل ہوئے تو سب کھڑے ہو گئے۔ ماسٹر جی کو ''آؤ جی خیر نال'' کہا۔ ہر ایک نے ان سے مصافحہ کیا۔ ہر ایک نے ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھی۔ ماسٹر جی نے چھوٹتے ہی ذرا شرما کر کہہ تو دیا کہ ابھی بال بچوں کی نوبت نہیں آئی لیکن ان نامولود برخورداروں کی خیریت بہر حال ہر ملاقاتی نے پوچھی کہ یہی ان کی تواضع کی ترکیب تھی۔ چونکہ ماسٹر جی نے پتلون پہن رکھی تھی لہٰذا فرش پر بٹھانے کی بجائے ان کے لیے رنگیلی چارپائی بچھا دی گئی۔

سلیم حیران ہو کر بولے: ''ابا جان! ان میں اتنی عقل نہ تھی کہ انھیں کرسی دیتے۔''

میں نے کہا: ''بیٹا! عقل تو تھی، کرسی نہ تھی۔''

سلیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا: ''اگر کرسی نہ تھی تو چودھری کس بات کے تھے؟''

میں نے کہا: ''ایک تو چودھری ذرا چھوٹی قسم کے تھے اور دوسرے گاؤں میں چودھری پن کی نمائش کرسیوں سے نہیں کی جاتی۔''

سلیم دیہاتیوں کی کوئی غلطی، کوئی کمزوری پکڑنے پر تُلا ہوا تھا، بولا:

''مگر کوئی گول کمرے میں گھوڑی بھی باندھتا ہے؟''

میں نے سلیم کو سمجھایا:

''اگر گھوڑی کے لیے کوئی علیحدہ مستطیل کمرا نہ ہو تو پھر وہ بھی گول کمرے میں رہتی ہے۔ علاوہ ازیں گاؤں کے کمرے اتنے گول بھی نہیں ہوتے!''

سلیم طنز کو پا گیا اور بولا:

''گول کمرا تو ویسے نام پڑ گیا ہے۔ ہمارا اپنا گول کمرا بھی تو چوکور ہے، مگر بات یہ ہے کہ ڈرائنگ روم میں گھوڑے گدھے کا کیا کام؟''

میں نے ہنس کر کہا:

"بیٹا! دیہاتی لوگ اتنے مہذب نہیں ہوتے کہ ڈرائنگ روم میں کتے لے آئیں۔ وہ گھوڑوں ہی سے گزارا کر لیتے ہیں۔"

علی بخش مسکرایا۔ سلیم کسی قدر چکرایا، لیکن کہانی بہر حال اشتیاق سے سُن رہا تھا، بولا:

"پھر کیا ہوا؟"

پھر گاؤں کا نائی ماسٹر جی کے پاؤں دابنے لگا۔ ایک نوکر کو دوڑایا گیا کہ ان کے لیے تازہ مکئی کے بھُٹے بھنوا کر لے آئے۔"

سلیم جھٹ بول اٹھے: "ابّا جان! مکئی کے بھٹے تو پک نِک پر کھائے جاتے ہیں۔ گھر میں تو چائے پلائی جاتی ہے، وہ لوگ اتنی بات بھی نہ جانتے تھے؟"

میں نے کہا: "یہ گھر میں پک نک منا لینے کی غلطی دیہاتیوں سے اکثر ہو جاتی ہے۔ بہر حال ماسٹر جی نے خود ان کی اصلاح کر دی اور بھٹے کا نام سن کر کہنے لگے:

"یہ تکلیف نہ کریں۔ ہو سکے تو ایک پیالی چائے پلا دیں۔ ذرا سردی بھی ہے۔"

سلیم نے فوری تائید کی: "بات بھی ٹھیک تھی۔ وقت جو چائے کا تھا۔"

میں نے کہا: "بات تو ٹھیک تھی، بشرطیکہ ان کے گھر چائے بھی ہوتی۔"

اس مقام پر سلیم میاں تیزی سے سوال کرنے لگے اور ہماری کہانی نے مکالمے کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ فوراً بولے:

"تو کیا ان کے گھر میں چائے ختم ہو گئی تھی؟"

"نہیں بیٹا! کبھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اُن دنوں چائے ابھی دیہات میں نہیں پہنچی تھی۔"

"تو کیا انھوں نے مہمان سے صاف کہہ دیا کہ ہمارے پاس چائے نہیں؟ کتنی شرم کی بات ہے!"

میں نے کہا: "بھئی میرے خیال میں پہلے تو گھر میں چائے کا نہ ہونا شرم کی بات نہیں۔ دوسرے انھوں نے مہمان کی خاطر چائے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور آخر مقامی حکیم کے گھر سے چائے مل بھی گئی۔ اُن دنوں چائے صرف مریضوں کو پلائی جاتی تھی۔"

سلیم نے لمبا سانس لیا اور بولے: "چلو شکر ہے چائے تو ملی۔"

میں نے کہا: "ہاں چائے تو مل گئی، لیکن پھر ایک عجیب سوال پیدا ہو گیا۔"

"یہی نا کہ چائے کے ساتھ کھانے کو کیا دیا جائے؟ وہاں تو لے دے کے مکئی کے بھُٹے ہی تھے!"

"نہیں بیٹے۔ یہ بات نہ تھی۔ سوال ذرا بنیادی نوعیت کا تھا اور وہ یہ کہ چائے بنائی کیسے جائے!"

سلیم نیم وحشت کے عالم میں میرا مُنھ تکنے لگا اور بولا: "ابا جان! چائے تو ہمارا جمعدار بھی بنا سکتا ہے اور دن بھر پیتا رہتا

ہے۔کیا وہ اتنے ہی اناڑی تھے؟

میں نے کہا: ''بھئی وہاں چائے پینے پلانے کا ہُنر پہنچا ہی نہ تھا۔ وہاں لسّی کا رواج تھا اور اس ہنر میں وہ یکتا تھے۔''

''تو کیا ماسٹر جی کو آخر لسّی پلا دی؟''

''نہیں پلائی تو چائے ہی تھی، لیکن وہ ایسی کامیاب چائے نہ تھی۔''

''یعنی چائے کی لسّی بنا دی؟''

''ہاں بیٹا، کچھ ایسا ہی ذائقہ ہوگا۔ چھوٹے چودھری کا کہنا ہے کہ ماسٹر جی نے ایک گھونٹ پیا، ٹھنڈی لگی اور پیالی رکھ دی؟''

''تو چودھری شرم سے غرق نہ ہوگیا؟''

''نہیں ایسا حادثہ تو نہ ہوا، البتہ چودھری کو اس بات کا رنج بہت ہوا کہ ماسٹر جی کی فرمائش پوری نہ کی جا سکی۔ بہرحال انھوں نے کچھ تلافی رات کے کھانے پر مرغ کے سالن سے کر دی۔''

''پھر ماسٹر جی کے لیے بستر لگایا گیا۔ چودھری نے ان کے لیے اکلوتی ریشمی رضائی نکلوائی اور وہ سفید جھالر والا تکیہ بھی، جس کے غلاف پر بارہ سنگھے کی تصویر کڑھی ہوئی تھی۔ بے شک تکیے میں لچک کی نسبت اکڑ زیادہ تھی اور ماسٹر جی کو اسے سر کے نیچے فٹ کرنے میں کچھ دِقّت بھی پیش آئی، لیکن آخر آرام سے سو گئے۔ صرف ایک مرتبہ آدھی رات کے قریب گھوڑی کے کھانسنے سے ذرا انگریزی میں بڑبڑا کر جاگ اٹھے، لیکن برابر ہی چودھری اور اس کا نوکر سو رہے تھے۔ انھوں نے گھوڑی کو چارا اور ماسٹر جی کو دلاسا دیا اور پھر صبح تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہ ہوا۔''

''ابا جان! صبح ہوتے ہی ماسٹر جی تو بھاگ نکلے ہوں گے؟''

''نہیں تو۔ وہ تو اطمینان سے جاگے۔ پہلے انھیں ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کرائی گئی، پھر انھوں نے غسل کیا۔''

''غسل بھی بیٹھک ہی میں کیا ہوگا؟''

''بیٹا، بیٹھک میں نہیں، مسجد میں۔''

''مسجد میں؟'' سلیم نے حیرت سے کہا: ''خانۂ خدا کو غسل خانہ بنا دیا؟''

میں نے کہا: ''بھئی گاؤں کے اکثر لوگ مسجد کے غسل خانوں ہی میں نہاتے ہیں اور بظاہر اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔ دیہاتی گھروں میں ہر کام کے لیے علیحدہ خانے کم ہی ہوتے ہیں۔''

سلیم کان پر ہاتھ رکھ کر بولے: ''خدا اس دیہاتی زندگی سے بچائے۔ ابا جان! اچھا ہوا آپ فوج میں آ گئے! ورنہ ہم بھی چھوٹے چودھری کی طرح مویشیوں کے ساتھ سو رہے ہوتے اور مسجد میں جا کر نہاتے۔''

''لیکن چھوٹا چودھری تو اس زندگی سے بھی ناخوش نہ تھا۔''

''مگر ابا جان! بے چارے ماسٹر جی کا کیا بنا؟''

''بنا یہ کہ ماسٹر جی نے غسل کے بعد ناشتا کیا اور پھر رخصت ہو گئے۔''

''ناشتا؟ چودھری کے گھر میں کارن فلیک تھے؟''

''کارن فلیک تو نہ تھے! البتہ جو کچھ دال دلیا تھا، غریب نے حاضر کر دیا۔''

''ابا جان! اس کے بعد چھوٹا چودھری تو سکول میں مُنھ دکھانے کے قابل نہ رہا ہوگا؟''

''نہیں بیٹا! سکول تو وہ اسی مُنھ سے گیا اور شہری لڑکوں نے اس سے کچھ مذاق بھی کیا.......... مگر وہ مگن رہا۔''

''چودھری کی جگہ میں ہوتا تو شرم سے مر جاتا۔''

''مگر چودھری تو جیتا رہا، بلکہ خاموشی سے پڑھتا بھی رہا اور آخر میٹرک پاس کر کے لاہور، کالج میں چلا گیا۔''

''وہ کالج بھی گیا؟ کیا ان کے پاس اتنے پیسے تھے؟''

''پیسے تو کم ہی تھے، مگر انھوں نے تھوڑی سی زمین بیچ دی۔''

''مگر تھوڑی سی زمین سے کیا بنتا ہے؟ کالج میں رہ کر کھانا ہوتا ہے۔ کچھ پہننا ہوتا ہے۔ کیا وہ مکئی کے بُھٹے کھاتا تھا؟ کیا وہ تہمد باندھتا تھا؟''

''بس گزارا ہی کر لیتا تھا؟''

''گزارا ہی کرتا رہا یا کچھ پڑھ بھی گیا؟''

''ہاں، کچھ پڑھ بھی گیا؟''

''پھر؟''

''پھر جیسا کہ ان کا دستور تھا، فوج میں بھرتی ہو گیا۔''

''پھر تو آپ اسے جانتے ہوں گے۔ کیا وہ آپ کے ماتحت کام کرتا ہے؟''

''ماتحت تو نہیں، مگر جانتا ضرور ہوں۔''

''تو ابّا جان اِسے بلایئے نا کبھی، ہم چھوٹے چودھری کو دیکھیں گے۔''

''دیکھیں گے؟ وہ کوئی تماشا تو نہیں، سلیم میاں۔''

''ابّا جان! بلایئے نا چھوٹے چودھری کو۔ ہم بالکل نہیں ہنسیں گے۔''

''سچ؟''

''بالکل سچ!''

''تو پھر آؤ۔ملو چھوٹے چودھری سے''............اور یہ کہ کر میں نے سلیم کی طرف بازو پھیلا دیے۔سلیم ایک لمحے کے لیے مبہوت کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور پھر یہ کہ کر مجھ سے لپٹ گیا:

''ابّا جان! آپ؟''

سلیم اور علی بخش دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور دونوں کی آنکھوں میں ایک دیہاتی کے لیے محبت کی چمک تھی۔ایاز اپنے اصلی لباس میں بھی ایسا معیوب نظر نہیں آتا تھا!

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) مصنف کو کس قسم کا بنگلا رہنے کو ملا؟

(ب) سلیم میاں کا مشغلہ کیا تھا؟

(ج) سلیم میاں، علی بخش پر کیوں برہم ہوئے؟

(د) دیہاتی لڑکا پہلے دن سکول گیا تو اُس نے کیسا لباس پہن رکھا تھا؟

(ہ) ماسٹر جی چھوٹے چودھری کے گاؤں کیوں گئے تھے؟

(و) ماسٹر جی کو چائے کیسے پیش کی گئی؟

(ز) دیہاتی لڑکے کی کہانی سُن کر سلیم میاں پر کیا اثر ہوا؟

۲۔ ''قدرِ ایاز'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۳۔ واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیں۔

دیہات، شکایت، ارشادات، قصہ، حادثات، روایت، عمارت، امتیاز، مشاہدات

۴۔ سبق ''قدرِ ایاز'' کے متن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے درست جواب کی نشاندہی (✓) سے کریں۔

(الف) کرنیلوں کو رہائش کے لیے کون سے بنگلے ملتے ہیں؟

(i) اے کلاس (ii) بی کلاس

(iii) سی کلاس (iv) ڈی کلاس

(ب) الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویے سے تھا:

(i) مدبرانہ (ii) امیرانہ

(iii) خاکسارانہ (iv) عاجزانہ

(ج) تمام دیہاتیوں نے ماسٹر جی سے کون سے برخورداروں کی خیریت دریافت کی؟

(i) نومولود (ii) شیرخوار
(iii) نامولود (iv) تابع دار

(د) ماسٹر جی کے بیٹھنے کے لیے کیا چیز منگوائی گئی؟

(i) پیڑھی (ii) کرسی
(iii) بنچ (iv) چارپائی

(ہ) ماسٹر جی نے کس چیز کی فرمائش کی؟

(i) کارن فلیک کی (ii) لسّی کی
(iii) چائے کی (iv) کافی کی

۵۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درست اور غلط جملوں کی نشاندہی (✓) سے کریں۔

		درست	غلط
(الف)	طرفین کے بیانوں سے واضح تھا کہ تنازع بہت خفیف ہے۔	درست	غلط
(ب)	سارے سکول میں ایک ہیڈ ماسٹر صاحب تھے جو سوٹ پہنتے تھے۔	درست	غلط
(ج)	سلیم اور علی بخش، دونوں کی آنکھوں میں ایک دیہاتی کے لیے مذاق کی چمک تھی۔	درست	غلط
(د)	دیہاتی لوگ اتنے مہذب نہیں ہوتے کہ ڈرائنگ روم میں کتے لے آئیں۔	درست	غلط
(ہ)	سلیم میاں ابھی ابھی ایف اے کے امتحان سے فارغ ہوئے تھے۔	درست	غلط

۶۔ اِعراب لگا کر تلفّظ واضح کریں۔

قسام ازل، قطعہ زمین، مخل، تواضع، تنازع

۷۔ اپنے استاد سے محمود و ایاز کی تلمیح کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

۸۔ مذکر اور مؤنث الفاظ الگ الگ کریں۔

طول، شان، چمن، تواضع، اشتیاق

۹۔ درجِ ذیل الفاظ کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

قباحت، امتیاز، نوعیت، تلافی، مبہوت، دستور

۱۰۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درجِ ذیل اقتباسات کی تشریح کریں۔

(الف) سلیم میاں جو ابھی .... ہاتھوں میں پلا تھا۔

(ب) علی بخش کی داستانِ غم .... دیہاتی سمجھا ہوگا۔

۱۱۔ کالم (الف) کے الفاظ کو کالم (ب) میں دیے گئے متضاد الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
طول	مسرت
داخل	ویرانہ
ازل	شدید
رنج	عرض
خفیف	ابد
چمن	خارج

روزمرہ اور محاورے کے لحاظ سے غلط فقرات کی درستی:

اہلِ زبان کی عام بول چال کو روزمرہ کہا جاتا ہے۔ روزمرہ میں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، جب کہ محاورہ دو یا دو سے زیادہ لفظوں کا ایسا مجموعہ ہے جو اپنے غیر حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کو درست بولنے یا لکھنے کے لیے اس کے روزمرے اور محاورے سے آشنائی ضروری ہے۔ اگر خلافِ زبان کوئی لفظ بولا یا لکھا جائے تو وہ غلط شمار ہوگا۔ ذیل میں ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن میں روزمرے یا محاورے کی غلطی موجود ہے۔

غلط فقرات:

☆ آج ہم نے میچ کھیلنا ہے۔
☆ اسلم شام کے پانچ بجے اکرم کو ملا۔
☆ تم تو ناک پر مچھر نہیں بیٹھنے دیتے۔
☆ صاحب کا حکم سر ماتھے پر۔
☆ اگر ممکن ہو سکے تو میرا کام کر دیجیے۔
☆ براہ مہربانی فرما کر خط کا جواب جلد دینا۔
☆ وہ تو ہمیشہ بے پر کی سناتی ہے۔
☆ یہ عورت تو آفت کی پرکالہ ہے۔

درست فقرات:

☆ آج ہمیں میچ کھیلنا ہے۔
☆ اسلم شام کے پانچ بجے اکرم سے ملا۔
☆ تم تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔
☆ صاحب کا حکم سر آنکھوں پر۔

☆ اگر ممکن ہو تو میرا کام کر دیجیے۔ ☆ مہربانی فرما کر خط کا جواب جلد دینا۔

☆ وہ تو ہمیشہ بے پر کی اڑاتی ہے۔ ☆ یہ عورت تو آفت کا پرکالہ ہے۔

سرگرمیاں:

۱۔ کرنل محمد خان کا کوئی اور مزاحیہ مضمون، اپنے استاد سے پوچھ کر پڑھیں۔

۲۔ طلبہ سے کہیں کہ انھیں یہ سبق پڑھ کر، جو بات سب سے زیادہ دلچسپ لگی ہو، اسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتائیں کہ مزاحیہ ادب اپنے ظاہری رویوں میں سنجیدہ ادب سے بالکل مختلف ہوتا ہے، لیکن ہر دو طرح کے ادب کا مقصد، معاشرے کی اصلاح ہے۔

۲۔ اساتذہ یہ سبق پڑھانے سے قبل ''ایاز'' کا تاریخی تعارف طلبہ کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ سلطان محمود غزنوی کس طرح اُس کی صلاحیتوں کی قدر کرتا تھا۔

۳۔ فوجی افسروں کے عہدوں کے بارے میں بتایا جائے۔

۴۔ دیہات میں چوپال اور چوپال کی اہمیت کی وضاحت کریں۔

۵۔ طلبہ کو اپنی علاقائی روایتوں اور قدروں کی حفاظت اور اُن سے محبت کا درس دیا جائے۔ انھیں سادگی اور خلوص کی تلقین کریں۔

حوصلہ نہ ہارو آگے بڑھو منزل اب کے دور نہیں

ہم نے اپنے پیارے وطن پاکستان کو بڑی قربانیاں دے کر بنایا ہے۔اس سرزمین پر رہنے والے سب لوگ ایک قوم ہیں اور انشاء اللہ ایک رہیں گے۔کوئی بھی اس قوم کے حوصلے پست نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہم کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دیں گے۔ پاکستان کے گوشے گوشے میں اس کی خاطر قربان ہونے والوں کی لا تعداد کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔آیئے آج ہم آپ کو پاکستان کے ایک قصبے میں رہنے والی ایک بہادر ماں کا واقعہ سناتے ہیں۔

ان سے ملئے یہ ہیں ہماری ''بی جان'' پورے قصبے کا ایک جانا پہچانا نام۔ بی جان انتہائی بہادر اور دلیری کا پیکر ہیں۔ہاں بھئی! بہادر اور دلیر کیوں نہ ہوتیں وہ ایک شہید کی بیٹی،شہید کی بیوی اور شہید کی ماں ہیں جن کے پیاروں نے اپنے وطنِ عزیز پاکستان کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں جانِ آفریں کے سپرد کر دیں۔بی جان ہمیشہ پُرعزم رہتیں۔وہ بڑی جرأت اور حوصلہ مندی سے ہرکسی کے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیتیں۔ان کی اس خوبی کی وجہ سے قصبے کا ہر چھوٹا بڑا ان کی عزت کرتا اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا۔کسی کے گھر میں کوئی جھگڑا ہو یا کسی بچے کی شادی بیاہ کا معاملہ، وہ ہر کام نمٹانے کو ہمہ وقت تیار رہتیں۔ ہرکسی کی ضروریات کا خیال رکھنے کی کوشش کرتیں اور خاص طور پر یہ دھیان رکھتیں کہ محلے میں کوئی بھوکا تو نہیں سویا۔یہی نہیں بلکہ وہ ہر ایک کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتیں۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں آرام دہ کرسی پر بیٹھی کسی کام میں مصروف تھیں کہ اچانک ٹیلی وِژن پر آنے والی ایک خبر سے پریشان ہوگئیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ کسی نے روئے زمین پر ایسا دردناک واقعہ نہ دیکھا ہوگا۔اس خبر میں سانحہ پشاور دکھایا جا رہا تھا جس میں دہشت گردوں نے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ معصوم طالبِ علم بچوں، اساتذہ اور گارڈز کو شہید کر دیا تھا۔یہ خبر سن کر پاکستان کیا پوری دنیا کے لوگ تڑپ اٹھے اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہوئی ہو۔اس خبر میں شہید ہونے والے بچوں کی تصویریں دیکھ کر ''بی جان'' کے تمام دکھ پھر سے تازہ ہوگئے اور شہید ہونے والے بچوں میں انہیں اپنا بچہ احمد ہی نظر آ رہا تھا۔انہیں آج بھی وہ دن یاد تھا کہ کیسے انہوں نے اپنے چھوٹے سے بچے کو دن رات کی مشقتیں جھیل کر پالا تھا۔محض اس خواب کو آنکھوں میں لیے کہ ایک دن وہ

بھی اپنے باپ اور نانا ابوّ کی طرح فوج میں جائے گا اور ملکِ عزیز کی خدمت کرے گا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جب ان کا بیٹا احمد ایف۔اے کے بعد فوج میں بطور آفیسر منتخب کر لیا گیا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر مختلف تیاریوں میں مصروف تھیں کیونکہ صبح ان کے بیٹے احمد نے ''کاکول اکیڈمی، ایبٹ آباد'' کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اچانک احمد نے کہا: امّاں جان میری کچھ ضروری چیزیں رہ گئی ہیں جو میں ساتھ والی مارکیٹ سے لے آتا ہوں۔ ابھی اسے گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ پورا قصبہ ایک زوردار دھماکے سے گونج اٹھا۔ پھر کیا تھا ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ احمد نے اپنی ہر چیز وہیں چھوڑی اور بڑی بہادری اور حوصلہ مندی سے دوسرں لوگوں کے ساتھ مل کر جلدی جلدی زخمیوں کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالنے لگا۔ فارغ ہونے کے بعد ابھی احمد پلٹنے ہی لگا تھا کہ ایک عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ اس آواز کی سمت بڑھا، جیسے ہی وہ اس عورت کو سہارا دے کر ایمبولینس میں ڈالنے لگا، ایک اور زوردار دھماکہ ہوا اور احمد بھی اس کی زد میں آ گیا۔

''بی جان'' کو جب معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا بڑی بہادری سے انسانی جانوں کو بچاتے ہوئے شہید ہوا ہے تو ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا مگر مامتا کو سکون نہ ملتا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ سے اور معاشرے سے سوال کرتیں کہ یہ کیسے دشمن ہیں جو کالی بھیڑوں کی طرح ہمارے اندر ہی چھپے ہوئے ہیں؟ ہم ان کو کیسے پہچانیں؟ ان کے ارادے کیا ہیں؟ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ میں اپنے بچے اور اِس جیسے ناحق شہید لوگوں کا خون کن کے ہاتھوں پر تلاش کروں؟

آج سانحہ پشاور میں سکول پر حملے کے بعد نہ صرف بی جان بلکہ سب پر عیاں ہو گیا کہ ان درندوں کا اصل مقصد کیا ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں؟ اب وہ صرف یہ سوچ رہی تھیں کہ وہ ان سے کیسے بدلہ لیں؟ ایسے میں ان کے کانوں میں ملی ترانے کی یہ آواز آئی:

؎ حوصلہ نہ ہارو آگے بڑھو، منزل اب کے دور نہیں

ساری رات اسی سوچ میں گذر گئی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر آخر وہ ایک فیصلے پر پہنچیں۔

''بی جان'' نے سب سے پہلے قصبے کے تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع ہونے کو کہا اور پھر آپس میں مشورے کے بعد بولیں: اب وقت آ گیا ہے کہ ان افراد کی پہچان قوم کے ہر بچے، بوڑھے، عورت اور ہر جوان کو کرنا ہے جنھوں نے ملک کے امن وامان کو داؤ پر لگایا ہوا ہے۔ ہم اپنے وطن عزیز کے کسی فرد کو ان کا نشانہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم سکون سے رہیں اور ہمارے بچے ان سفاک دہشت گردوں سے محفوظ رہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم چند چیزوں کو اپنی زندگی کا معمول بنا لیں۔ جس کی تیاری آپ سب کو میرے ساتھ مل کر کرنی ہے اور اس قومی کام میں سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے اور ہر شخص کو دہشت گردی کے ناسور کو ختم کرنے میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں سکول پر حملہ کر کے دہشت گردوں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ درندے ہمیں تعلیم سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور جہالت سے بڑی کوئی لعنت نہیں۔ ہمیں ان سے بدلہ لینے کے لیے صرف یہ

کرنا ہے کہ اپنی قوم کو جہالت کے اندھیروں سے نکالنا ہے اور علم کی روشنی کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانا ہے۔ علم کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔ پہل میں کرتی ہوں اور اس کام کے لیے میں اپنے گھر میں ایک ''آگاہی سنٹر'' بناتی ہوں جو دوسرے مرد و خواتین کو ناگہانی حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے ہر طرح کی ضروری معلومات دے گا۔

تاہم انفرادی طور پر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ:

* اپنے محلے، قصبے اور ٹاؤن کی سطح پر اپنی مدد آپ کے تحت سکولوں کی تعمیر و مرمت کا کام کرنے کی کوشش کریں جن سکولوں میں مناسب چار دیواری نہیں اسے بنانے کی کوشش کریں۔
* سکولوں کے گرد و نواح پر نظر رکھیں نیز مشکوک شخص، چیز اور لاوارث سامان پر بھی نظر رکھیں۔ سکول کے اوقاتِ کار میں کسی اجنبی شخص کو بغیر تحقیق سکول کی طرف نہ آنے دیں۔
* اپنے محلے اور قصبے میں داخل ہونے والے ہر اجنبی شخص کی چھان بین کریں۔
* اپنے محلے اور قصبے میں داخل ہونے والے ہر مشکوک پھیری اور ٹھیلے والے کو چیک کریں۔

* ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے کن اہم فون نمبرز پر رابطہ کرنا ہے اس کا بورڈ تقریباً ہر محلے میں نمایاں جگہ پر لگائیں۔
* ہر محلے اور قصبے کے دُکاندار اپنی اپنی دکان کھولنے سے پہلے ارد گرد کا جائزہ لیں کہ کوئی مشکوک چیز مثلاً سائیکل، موٹر سائیکل یا گاڑی وغیرہ لاوارث تو نہیں کھڑی اگر ہے تو فوراً اطلاع دیں۔

* کرایہ دار اور گھریلو ملازم کو رکھنے سے پہلے متعلقہ تھانوں میں ان کے شناختی کارڈ وغیرہ کی جانچ پڑتال اور اندراج لازمی کروائیں۔
* ہر محلے اور قصبے میں ایسے آگاہی سنٹر ہوں جو لوگوں کو ناگہانی

حالات سے نمٹنے کے لیے ضروری تربیت دیں۔ اس سلسلے میں تربیت یافتہ لوگ آگے بڑھیں مثلاً ریٹائرڈ فوجی، پولیس وغیرہ کے لوگ۔

بی جی نے لمبی سانس لے کر پھر کہا:

دہشت گردی اور قتلِ عام سے ڈر کر خاموشی اختیار کرنے کی بجائے اس ظلم کے خلاف ہر سطح پر آواز بلند کرکے ہمیں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔ اگر چہ حکومت ان سے نمٹنے کے لیے ضروری اقدامات اٹھا رہی ہے۔ تاہم پھر بھی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنی مدد آپ کے تحت کیا کچھ کر سکتے ہیں:

* ہمیں اپنے گھریلو ماحول کو بہتر بنانا ہوگا تاکہ بچوں کو محب الوطن اور باعمل انسان بنا سکیں۔
* بچوں کو گھریلو سطح پر ہی ایک دوسرے کا احترام سکھانے کی کوشش تیز کرنا ہوگی اور ہمیں خود اس کی عملی تصویر بننا ہوگا۔
* ہمیں اپنے ہمسایوں سے تعلقات بہتر بنانے ہوں گے اور ایک دوسرے کے دکھ، درد میں عملاً شریک ہونا ہوگا۔
* ہمیں ایک دوسرے کے نظریات اور عقائد کا اتنا ہی احترام کرنا ہوگا جتنا ہم اپنے نظریات و عقائد کا کرتے ہیں۔
* آپس میں محبت، رواداری اور برداشت کے جذبات کو فروغ دینا ہوگا۔
* بحیثیت پاکستانی ہم سب پر فرض ہے کہ ہم ہر پاکستانی کے جان و مال کو محفوظ بنائیں۔ اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ تمام محلوں اور قصبوں میں موجود مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے عقائد کے مطابق اپنی مذہبی عبادات اور تہوار امن و سکون کے ساتھ منا سکیں۔
* ہر کوئی ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے۔
* غریبوں اور ضرورت مندوں کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کریں۔
* یاد رکھیے کہ جب کبھی آپ کسی ایسی جگہ پر جائیں جہاں کی سیکورٹی پر لوگ متعین ہوں مگر وہ اپنے فرض سے غفلت کرتے ہوئے آپ کو توجہ سے چیک نہ کریں تو اُنھیں ایسا کرنے سے منع کریں اور ساتھ ہی ممکنہ حادثات سے اپنی اور دوسروں کی جان محفوظ کرنے کے لیے اُن کی اس غفلت کی اطلاع متعلقہ لوگوں کو ضرور دیں۔ ایسا کرنے سے ہم یقیناً خطرناک حادثات سے بچ سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اگر ہم اپنی مدد آپ کے تحت اپنے اپنے محلے، قصبے اور ٹاؤن کی سطح پر کام کریں تو یقیناً ہم دہشت گردی کی لعنت کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

"پاکستان زندہ باد"

مشق

1- درست جملے کے سامنے (✓) اور غلط جملے کے سامنے (×) کا نشان لگائیں:

i- سکولوں کو دہشت گردی سے محفوظ بنانے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟
(ا) سیکیورٹی گارڈ (ب) سی سی ٹی وی کیمرہ
(ج) خاردار تار (د) تمام

ii- ایمرجنسی نمبرز کا نمایاں جگہ پر چسپاں کرنا کیوں ضروری ہے؟
(ا) یاددہانی کے لیے (ب) سجاوٹ کے لیے
(ج) قانونی تقاضہ پورا کرنے کے لیے (د) پولیس اور متعلقہ محکمہ کو فوری اطلاع دینے کے لیے

iii- سکول میں مشکوک بیگ نظر آنے کی صورت میں
(ا) دوستوں کو بتایا جائے (ب) ٹیچر کو بتایا جائے
(ج) ایمرجنسی فون پر اطلاع کی جائے (د) بیگ کو خود ہٹایا جائے

iv- دہشت گردی کے خاتمے میں اہم کردار ہے۔
(ا) الیکٹرانک میڈیا کا (ب) مسجد کا
(ج) مدرسے کا (د) تمام کا

v- محلے میں آگاہی سینٹر کے قیام کا مقصد
(ا) تربیت یافتہ لوگوں کو آگے لانا (ب) باہمی میل جول
(ج) ایک دوسرے کو اطلاع دینا (د) پولیس کی مدد کرنا

vi- دکاندار دکان کھولنے سے پہلے دہشت گردوں کے حوالے سے جائزہ لیں
(ا) تالوں کا (ب) اردگرد لوگوں کا
(ج) اردگرد مشکوک اشیا کا (د) دکان کے اندر اشیا کا

vii- سانحہ پشاور کب پیش آیا؟
(ا) 13 دسمبر 2014ء کو (ب) 14 دسمبر 2014ء کو
(ج) 15 دسمبر 2014ء کو (د) 16 دسمبر 2014ء کو

viii- دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے کس کے ساتھ کام کرنا ہوگا:
(ا) فوج (ب) پولیس (ج) عوام (د) سب کے ساتھ

ix- اپنی مدد آپ کے تحت دہشت گردی سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے:
(ا) نفرت و جہالت ختم کرکے (ب) عدم برداشت ختم کرکے
(ج) تفرقہ بازی ختم کرکے (د) ان سب کو

x- کاکول اکیڈمی واقع ہے:

(ا) ایبٹ آباد (ب) مظفرآباد (ج) نتھیاگلی (د) گھوڑا گلی

2- مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں:

مناسب الفاظ
1717
چھان بین
16دسمبر 2014
ایبٹ آباد

i- سانحہ پشاور ________ کو ہوا۔

ii- ملٹری اکیڈمی کاکول ________ میں واقع ہے۔

iii- ہمیں محلے اور قصبے میں داخل ہونے والے ہر اجنبی شخص کی ______ کرنی چاہیے۔

iv- کسی پُراسرار سرگرمی کی فوری اطلاع ________ پر دینی چاہیے۔

3- درست جملے کے سامنے (✓) اور غلط جملے کے سامنے (×) کا نشان لگائیں:

i- جہالت سب سے بڑی لعنت ہے۔

ii- ہمیں اپنے محلے میں داخل ہونے والے اجنبی شخص کی چھان بین نہیں کرنی چاہیے۔

iii- ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے 1717 پر اطلاع دی جاتی ہے۔

iv- کرایہ دار رکھتے وقت متعلقہ تھانوں میں اُن کے شناختی کارڈ کا اندراج لازمی کروانا چاہیے۔

v- ہمیں ایک دوسرے کے عقائد اور نظریات کا احترام کرنا چاہیے۔

4- درج ذیل الفاظ کی مدد سے ایسے جملے بنائیں جو اُن کا مفہوم واضح کر دیں:

i- افراتفری : ....

ii- جہالت : ....

iii- مشکوک : ....

iv- محبِ وطن : ....

v- عقائد : ....

vi- غفلت : ....

5- سبق کے متن کو سامنے رکھ کر درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں:

i- آپ اپنے سکول میں دہشت گردی کی روک تھام کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

ii- ایک دکاندار اپنے علاقے میں کس طرح دہشت گردی کی روک تھام میں معاونت کر سکتا ہے؟

iii- لوگوں کو دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے اپنی مدد آپ کے تحت کیا کرنا چاہیے؟

iv- دہشت گردی کو روکنے کے لیے کرایہ داروں کے لیے ضروری معیار مختصراً بیان کریں۔

v- محلے میں دہشت گردی کے حوالے سے آگاہی سینٹر کے قیام کے کیا مقاصد ہو سکتے ہیں؟

شہدائے پشاور کے لیے ایک نظم

تم زندہ ہو
جب تک دنیا باقی ہے، تم زندہ ہو
تم زندہ ہو
اے میرے وطن کے شہزادو تم زندہ ہو
خوشبو کے رُوپ میں اے پھولو تم زندہ ہو
ہر ماں کی پُرنم آنکھوں میں۔ ہر باپ کے ٹوٹے خوابوں میں
ہر بہن کی اُلجھی سانسوں میں۔ ہر بھائی کی بکھری یادوں میں
تم زندہ ہو ۔ تم زندہ ہو
ہم تم کو بھول نہیں سکتے۔ یہ یاد ہی اب تو جیون ہے
ہر دل میں تمہاری خوشبو ہے۔ ہر آنکھ تمہارا مسکن ہے
تم زندہ ہو ۔ تم زندہ ہو
جن کو بھی شہادت مل جائے۔ وہ لوگ امر ہو جاتے ہیں
یادوں کے چمن میں کھِلتے ہیں۔ خوشبو کا سفر ہو جاتے ہیں
تم بجھے نہیں ہو روشن ہو
ہر دل کی تم ہی دھڑکن ہو
تم زندہ ہو ۔ تم زندہ ہو
کل تک تھے بس اپنے گھر کے باسی تم
اب ہر اک گھر میں بستے ہو
تم زندہ ہو
اے میرے وطن کے شہزادو تم زندہ ہو
خوشبو کے رُوپ میں اے پھولو تم زندہ ہو
جب تک دنیا باقی ہے تم زندہ ہو
تم زندہ ہو ۔

(امجد اسلام امجدؔ)

حصّہ نظم

خواجہ الطاف حسین حالؔی

(۱۸۳۷ء.........۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالؔی، پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تھا، جو غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش نے انتہائی عُسرت اور تنگ دستی میں زندگی گزاری۔ حالؔی ابھی نو سال کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی اور بہن نے حالؔی کی پرورش کی۔ سترہ سال کی عمر میں، ان کی رضامندی کے بغیر، ان کی شادی کر دی گئی۔ علم کے شوق میں یہ بیوی کو میکے چھوڑ کر دِلّی چلے گئے اور وہاں سال ڈیڑھ سال معروف عالم اور واعظ مولوی نوازش علی کے مدرسے میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کلکٹری میں ملازم ہو گئے، مگر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے باعث انھیں واپس آنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مصاحب اور اُن کے بچوں کے اتالیق رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے شاعری میں مرزا غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔ گورنمنٹ بک ڈپو، لاہور اور اینگلو عربک سکول، دِلّی میں ملازمت کی۔ ۱۹۰۴ء میں انھیں ''شمس العلما'' کا خطاب ملا۔

مولانا حالؔی کا شمار اُردو ادب کے اہم شاعروں، نثر نگاروں اور تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اُنھوں نے قدیم اور روایتی طرز کی شاعری کی، مگر بعد میں حالات کی تبدیلی نے اُن کے خیالات کو یکسر بدل ڈالا۔ انجمنِ پنجاب کی تحریک، گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت اور سر سیّد احمد خان سے وابستگی نے، ان کے نئے خیالات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا حالؔی کی اخلاقی، اصلاحی اور مِلّی شاعری نے اُردو ادب پر بہت گہرے اثرات مرتّب کیے۔ انھیں جدید شاعری، تنقید نگاری اور سوانح نگاری میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ مولانا حالؔی نے نثر اور نظم میں کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ اُن کی اہم کتابوں میں ''دیوانِ حالؔی''، ''مسدّسِ حالؔی'' (مد و جزرِ اسلام)، ''مقدمۂ شعر و شاعری''، ''یادگارِ غالب''، ''حیاتِ سعدی'' اور ''حیاتِ جاوید'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

حمد

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو حمد و ثنا کے معنی و مفہوم اور اہمیت سے متعارف کرانا۔
۲۔ طلبہ کو اللہ ربّ العزت کی ذات و صفات کے مختلف پہلوؤں سے آ گاہ کرنا۔
۳۔ طلبہ کے دلوں میں توحید کی عظمت اور ایمان کی پختگی کا احساس پیدا کرنا۔

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدّم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہوگا حق کیسے ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کُھلا تیرا

جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سُلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

تُو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط اُن کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گِلا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام، صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالؔی ہے سب سے جُدا تیرا

مشق

۱۔ حمد کے حوالے سے درجِ ذیل سوالات کے جواب لکھیں۔

(الف) کون سا بندہ حمد سرا ہے؟

(ب) کس کا حق سب سے مقدّم ہے؟

(ج) محرم اور نامحرم میں کیا فرق ہے؟

(د) اللہ کا گدا کس میں مگن رہتا ہے؟

(ہ) بادِ صبا گھر گھر کیا لیے پھرتی ہے؟

۲۔ اس حمد میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کی کون کون سی صفات بیان کی ہیں؟

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ و مرکبات کے معنی لکھیں۔

مقدّم، محرم، خلعتِ سُلطانی، محیط، آفاق، بندۂ نافرماں

۴۔ تیسرے شعر میں شاعر نے ''محرم'' اور ''نامحرم'' کو کس لیے ایک جیسا قرار دیا ہے؟

۵۔ درجِ ذیل اشارات کی مدد سے حمد کا خلاصہ مکمل کریں۔

دلوں پر اللہ کا قبضہ............نافرمان بندہ اور حمد سرائی............اللہ کی بندگی کا حق کس سے ادا ہو............محرم و نامحرم برابر ہیں............خلعتِ سُلطانی............ ہر شے پہ محیط ہے............ ہر طرف اُس کی خوشبو ہے............حالؔی کا بیان سب سے جُدا ہے۔

۶۔ اِعراب لگا کر تلفّظ واضح کریں:

بندہ نافرماں، حمد سرا، مقدم، محرم، خلعت سلطانی، رنج و مصیبت، آفاق، رنگ بیاں

۷۔ مناسب لفظ کی مدد سے مصرعے مکمل کریں۔

(الف) گو سب سے ...... ہے حق تیرا ادا کرنا

(ب) محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے ......

(ج) ...... نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سُلطانی

(د) ...... میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری

(ہ) ہر بول ترا ...... سے ٹکرا کے گزرتا ہے

۸۔ 'نافرمان' اور 'نامحرم' میں 'نا' سابقہ ہے۔ آپ ایسی پانچ مثالیں تلاش کریں جن میں 'نا' سابقے کے طور پر استعمال ہوا ہو۔

۹۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
بندۂ نافرماں	مہک
مقدّم	رنگِ بیاں
محرم	صبا
کملی	خلعتِ سلطانی
آفاق	نامحرم
پیغام	حق
بول	حمد سرا

قافیہ:

شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہا جاتا ہے۔ ہر شعر میں قافیہ تبدیل ہوتا ہے تاہم ان کی صوت (آواز) ایک جیسی رہتی ہے۔ قافیہ کی جمع قوافی ہے۔ قافیے کی چند مثالیں دیکھیں:

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

ان اشعار میں ہوا، دوا، ماجرا اور دُعا قافیے ہیں۔ یہ تمام الفاظ ہم آواز ہیں۔

ردیف:

ردیف کے لغوی معنی سوار کے پیچھے بیٹھنے والے کے ہیں۔ شعر کے آخر میں آنے والے لفظ یا الفاظ کے مجموعے کو ردیف کہا جاتا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ یا الفاظ قافیے کے بعد آتے ہیں اس لیے انھیں ردیف کا نام دیا گیا ہے۔ ہر شعر میں ردیف کا لفظ یا الفاظ ہو بہو دُہرائے جاتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ردیف کی چند مثالیں دیکھیں:

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ان اشعار میں الفاظ "نہیں آتی" ردیف کی مثالیں ہیں۔ یہ الفاظ بغیر کسی تبدیلی کے ہر شعر میں دُہرائے گئے ہیں۔

سرگرمیاں:

۱۔ کسی اور شاعر کے کلام سے حمد تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیں۔
۲۔ طلبہ سے اس حمد کی درست آہنگ کے ساتھ بلند خوانی کرائی جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ، طلبہ کو بتائیں کہ ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو "حمد" کہلاتی ہے۔
۲۔ اساتذہ، طلبہ کو "مسدسِ حالی" کے بارے میں بھی تفصیل سے بتائیں کہ برصغیر کے مسلمانوں پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔
۳۔ حمدیہ شاعری اور اُس کی روایت کے بارے میں بنیادی باتیں بتائی جائیں۔
۴۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اشعار کی تشریح کی جائے۔ مثلاً پانچواں شعر پڑھاتے ہوئے اس کا حوالہ دیا جائے:

ان اللہ علیٰ کلّ شیءٍ قدیر
(یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

امیؔر مینائی

(۱۸۲۸ء...........۱۹۰۰ء)

منشی امیر مینائی، نصیرالدین حیدر (شاہِ اودھ) کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی کرم محمد تھا۔ آپ حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنویؒ کی اولاد سے تھے، اسی لیے اپنے نام کے ساتھ ''مینائی'' لکھتے تھے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم مفتی سعد اللہ رام پوری سے حاصل کی۔ بعدازاں تعلیم کی تکمیل کے لیے علمائے فرنگی محل کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ منشی مظفر علی اسیؔر سے شاعری میں اصلاح لی۔ کم عمری ہی میں شاعری میں بلند مقام حاصل کر لیا۔ ابھی آپ کی عمر بیس سال تھی کہ نواب واجد علی خاں نے اپنے دربار میں طلب کیا اور کلام سُنا۔ بیالیس سال رام پور کے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلبِ علی خاں کے اُستاد رہے۔ آخری زمانے میں نواب مرزا داغؔ نے اُنھیں حیدر آباد بُلوایا، وہاں جاتے ہی بیمار ہو گئے اور اسی بیماری کے دوران میں انتقال ہوا۔

امیؔر مینائی کا شمار اپنے عہد کے قادرالکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تمام اصناف میں شاعری کی مگر غزل اور نعت کی طرف زیادہ رُجحان رہا۔ آپ کی شاعری، زبان و بیاں کی خوبیوں اور فکر و خیال کی رعنائیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی نعتوں میں، آورد کے مقابلے میں آمد کا رنگ غالب ہے۔ انھوں نے محاورات اور صنائع کو اس عمدگی سے برتا ہے کہ کلام میں کہیں بھی تصنّع پیدا نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے الفاظ و تراکیب کا استعمال بھی محتاط ہو کر کیا ہے اور حتی الامکان سادگی اور روانی کا پہلو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ان کی نعتوں میں درد و اثر اور سوز و گداز کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

ان کی تصانیف میں دو عشقیہ دیوان: ''مرآۃ الغیب''، ''صنم خانۂ عشق'' اور ایک نعتیہ دیوان ''محامدِ خاتم النبیینؐ'' شامل ہیں۔ انھوں نے شاعروں کا ایک تذکرہ ''انتخابِ یادگار'' کے نام سے مرتب کیا۔ اُن کا نا تمام لغت ''امیر اللغات'' بھی ان کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔

امیرؔ مینائی

نعت

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو نعت کے معنی و مفہوم اور اہمیت سے متعارف کرانا۔
۲۔ طلبہ کو نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی ذات و صفات کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنا۔
۳۔ طلبہ کے دلوں میں رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی عقیدت و محبت کے جذبات اُجاگر کرنا۔

صبا بے شک آتی مدینے سے تُو ہے
کہ تجھ میں مدینے کے پھولوں کی بُو ہے

سُنی ہم نے طوطی و بلبل کی باتیں
ترا تذکرہ ہے، تری گفتگو ہے

جیوں تیرے در پر، مروں تیرے در پر
یہی مجھ کو حسرت یہی آرزو ہے

جسے جس طرف آنکھ، جلوہ ہے اُس کا
جو یک سو ہو دل تو وہی چار سُو ہے

تری راہ میں خاک ہوجاؤں مر کر
یہی میری حُرمت ، یہی آبرو ہے

یہاں ہے ظہور اور وہاں نور تیرا
مکاں میں بھی تُو ، لامکاں میں بھی تُو ہے

جو بے داغ لالہ ، جو بے خار گُل ہے
وہ تُو ہے ، وہ تُو ہے ، وہ تُو ہے ، وہ تُو ہے

(محامدِ خاتم النبیینؐ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) صبا کہاں سے آتی ہے؟

(ب) پھولوں میں کس کی خوشبو ہے؟

(ج) شاعر کے دل میں کیا حسرت اور آرزو ہے؟

(د) شاعر اپنی حرمت و آبرو کس بات میں خیال کرتا ہے؟

(ہ) طوطی و بلبل کس کا ذکر کرتے ہیں؟

۲۔ اس نعت میں ردیف کیا ہے؟

۳۔ اس نعت کے قافیے اپنی کاپی میں لکھیں۔

۴۔ نعت کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۵۔ لالے کے بے داغ اور گل کے بے خار ہونے سے کیا مُراد ہے؟

۶۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
صبا	لامکاں
طوطی	نُور
تذکرہ	آرزو
جبیں	چارسُو
حسرت	آبرو
یک سو	مروں
حُرمت	گفتگو
ظہور	بُلبل
مکاں	بُو

۷۔ نیچے دیے گئے اشارات کی مدد سے نعت کا خلاصہ لکھیں۔

صبا کا مدینے سے آنا............طوطی و بلبل اور رسولِ پاک صَلَّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا تذکرہ............درِ رسول صَلَّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر مرنے جینے کی آرزو............ہر طرف اُسی کا جلوہ............خاکِ مدینہ باعثِ حُرمت......مکاں ولامکاں میں اُسی کا نور و ظہور......بے داغ لالہ اور بے خار گُل۔

۸۔ اِعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں۔

طوطی و بلبل، تذکرہ، گفتگو، حرمت، آبرو، ظہور، داغ لالہ، خار گل

سرگرمیاں:

۱۔ بچوں کے درمیان نعت خوانی کا مقابلہ کرایا جائے۔

۲۔ آپ اپنی پسندیدہ نعت، اپنی کاپی پر لکھیں اور استاد صاحب کو دکھائیں۔

۳۔ طلبہ سے امیؔر مینائی کی اس نعت کو درست آہنگ کے ساتھ جماعت کے کمرے میں پڑھوائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتائیں کہ نعت ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں نبی کریم صَلَّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو۔

۲۔ اردو شاعری میں نعت کی روایت اور اہمیت کو مختصر طور پر بیان کریں۔

۳۔ ہر بچے سے درست تلفّظ کے ساتھ نعت کی قرأت کرائی جائے۔

نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۵ء............۱۸۳۰ء)

نظیرؔ کا اصل نام ولی محمد ہے۔ آپ دِلّی میں پیدا ہوئے، مگر چوں کہ عمر کا زیادہ حصہ اکبر آباد میں گزارا، اس لیے اپنے نام کے ساتھ اکبر آبادی لکھتے تھے۔ بارہ بھائیوں میں صرف نظیر زندہ بچے، اس لیے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچے اور تاج محل کے قریب مکان میں رہنے لگے۔ نظیر کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں، تاہم وہ عربی، فارسی، ہندی اور ہندوستان کی کئی دوسری زبانیں جانتے تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا۔ اسی مزاج کی وجہ سے وہ درباروں سے دُور رہے۔ نواب سعادت علی خان نے انھیں لکھنؤ بلوایا، وہ نہ گئے۔ اسی طرح بھرت پور کے رئیس کی دعوت بھی ٹھکرا دی۔ متھرا میں کچھ عرصہ معلّم رہے مگر جلد ہی نوکری چھوڑ کر آگرہ آ گئے اور سترہ روپے ماہوار پر لالہ بلاس رام کے بچّوں کے اتالیق ہو گئے۔ نظیرؔ نے طویل عمر پائی۔ آخری عمر میں فالج کے عارضے میں مبتلا ہوئے اور اسی بیماری کے باعث انتقال کیا۔

نظیرؔ اکبر آبادی نے میرؔ و سوداؔ، ناسخؔ و آتشؔ اور انشاؔ و جرأتؔ کا زمانہ دیکھا، مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث سب سے الگ رہے۔ اُن کی شاعری عوامی ہے۔ انھوں نے اپنے قرب و جوار کے ماحول، اپنے عہد کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کو بڑی عمدگی کے ساتھ اپنی شاعری میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے شعر و سخن کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا، جن کا تعلق براہِ راست عوامُ النّاس، بالخصوص غریب اور مفلس طبقے سے تھا۔ ان کی نظموں میں مناظرِ فطرت، مذہبی تہوار، سماجی رسوم، میلوں ٹھیلوں، جانوروں حتّٰی کہ پھلوں اور سبزیوں کا جا بجا ذکر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اُردو نظم گوئی کے دامن کو وسیع کیا۔

انھوں نے طویل اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ مناظرِ فطرت، موسموں اور تہواروں پر ان کی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں ان کے غیر معمولی مشاہدے اور زندگی کے گہرے تجربوں کی عکاس ہیں۔ نظیرؔ کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ اُن کی شاعری کا ضخیم کلیات اُردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

برسات کی بہاریں

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو نظمیہ شاعری میں منظر نگاری کے انداز اور اُسلوب سے آگاہ کرنا۔

۲۔ نظیرؔ اکبر آبادی کے اُسلوبِ بیان سے روشناس کرانا۔

۳۔ اُردو نظم کے ارتقا میں نظیرؔ اکبر آبادی کے کردار سے متعارف کرانا۔

۴۔ طلبہ کو مخمس کی ہیئت کا تعارف کرانا۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بُوندوں کی جھجھاہٹ، قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دُھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ، کچھ ابر کی سیاہی
اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی
یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی!
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یا رب، سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت
تیتر پُکارتے ہیں سُبحان تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو! برسات کی بہاریں

(کلیاتِ نظیرؔ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) پہلے بند میں کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

(ب) تیسرے بند میں موجود ردیف کی نشاندہی کریں۔

(ج) چوتھے بند میں کون سا لفظ بطور ردیف استعمال ہوا ہے؟

(د) تیتر اللہ تعالیٰ کی عظمت کیسے بیان کرتے ہیں؟

(ہ) گلزار کے بھیگنے اور سبزے کے نہانے سے کیا مراد ہے؟

۲۔ شاعر نے نظم ''برسات کی بہاریں'' میں برسات کے جو مناظر بیان کیے ہیں، اُن کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۳۔ ''قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۴۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

برسات، لہلہاہٹ، گلزار، سبحان، جھجھاہٹ

۵۔ مذکر اور مؤنث الفاظ کی نشاندہی کریں۔

ہوا، بادل، بہار، برسات، سبزہ، قدرت، گلزار، رنگ، تیتر، گھٹا

۶۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
سبزہ	سیاہی
بوندیں	بچھونے
بادل	سبحان
پانی	ماہی
ہرے	جل تھل
تیتر	مست
ماہ	جھمجھماہٹ
ابر	لہلہاہٹ

۷۔ جس نظم کے ہر بند میں ایک ہی مصرع بار بار دُہرایا جائے اُسے ''ٹیپ کا مصرع'' کہتے ہیں۔اس نظم میں ٹیپ کے مصرع کی نشان دہی کریں۔

۸۔ نظم ''برسات کی بہاریں'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۹۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کریں۔

لہلہاہٹ،جل تھل،گلزار،گھٹائیں،ماہ تا بہ ماہی

تشبیہ:

کسی چیز کو کسی خاص وصف کی وجہ سے کسی دوسری چیز کی مانند یا اُس جیسا قرار دینا،تشبیہ کہلاتا ہے،جیسے خوبصورت چہرے کو پھول کی مانند قرار دینا۔ارکان تشبیہ پانچ ہیں۔پہلی چیز کو مشبہ،دوسری چیز کو مشبہ بہ اور دونوں کے درمیان مشترک خوبی یا صفت کو وجہِ شبہ کہتے ہیں۔حرفِ تشبیہ اور غرضِ تشبیہ بھی تشبیہ کے ارکان ہیں۔تشبیہ کا مقصد عام چیز کی خوبی کو واضح کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ہے۔تشبیہ سے بات میں خوب صورتی پیدا ہوتی ہے اور بیان دل چسپ ہو جاتا ہے۔

تشبیہ کی مثالیں دیکھیں:

(الف) اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں۔

(ب) اس کے لب پُھول کی طرح نازک ہیں۔

(ج) اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے۔

(د) اس کا قد سرو کی طرح لمبا ہے۔

(ہ) وہ لومڑی کی طرح چالاک ہے۔

ان مثالوں میں دانت، لب، دل، قد اور وہ (کوئی شخص) مشبہ ہیں جب کہ موتی، پھول، پتھر، سرو اور لومڑی مشبہ بہ۔ ان مثالوں میں بالترتیب سفیدی، نازکی، سختی، لمبائی اور چالاکی تشبیہ کی وجوہات یا وجہِ شبہ کی مثالیں ہیں۔ حرفِ تشبیہ ایسے لفظ یا الفاظ کو کہتے ہیں جو مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان رابطہ پیدا کرتے ہیں جیسے: کی مانند، کی طرح، کی صورت، جیسا، سا، وغیرہ۔ غرضِ تشبیہ سے مراد وہ مقصد یا سبب ہے جس کے لیے تشبیہ کا سہارا لیا گیا ہے۔

سرگرمیاں:

۱۔ اس نظم کے علاوہ کوئی اور ایسی نظم تلاش کریں جو مخمس کی شکل میں ہو۔ اُسے اپنی کاپی میں لکھیں۔

۲۔ آپ کون کون سے خوش آواز پرندوں کے بارے میں جانتے ہیں؟ ان کے نام لکھیں۔

۳۔ ''برسات'' کے موضوع پر طلبہ کے درمیان مضمون نویسی کا مقابلہ کرایا جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو نظیر اکبر آبادی اور ان کی عوامی شاعری کا مختصر تعارف کرائیں۔

۲۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ مخمس ایسی نظم کو کہتے ہیں، جس کے ہر بند کے پانچ مصرعے ہوں۔

۳۔ طلبہ کو مخمس کے علاوہ نظم کی چند دیگر نمایاں ہیئتوں کے بارے میں بتائیں۔

۴۔ یہ نظم منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ طلبہ کو منظر نگاری کے متعلق تفصیل سے بتائیں۔

علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷ء............۱۹۳۸ء)

ہمارے قومی اور ملّی شاعر، مفکّر اور نظریہ پاکستان کے خالق علامہ محمد اقبالؒ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے اور وہاں سے بار ایٹ لا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وطن واپسی پر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۳۰ء میں خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا نظریہ پیش کیا۔ ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا اور لاہور میں شاہی مسجد کے قریب دفن ہوئے۔

علامہ اقبالؒ نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں پُر اثر اور پُر سوز شاعری کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا مگر بعد میں زیادہ تر توجہ نظم نگاری کی جانب مبذول کر دی کیونکہ قوم تک اپنا پیغام پہنچانے کا یہ زیادہ مؤثر ذریعہ تھا۔ اقبال کا دائرۂ فکر، مشاہدۂ کائنات اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سچے عاشق تھے اور اس چاہت اور عقیدت کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔

اقبالؒ نے محض روایتی عشق و عاشقی کے موضوعات سے ہٹ کر اپنی شاعری میں زندگی، کائنات، خدا، ابلیس، عقل و خرد، تصوف، قومیت، مردِ مومن، سیاست و مملکت اور خودی و بے خودی کا فلسفہ پیش کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ جیسا عظیم شاعر و فلسفی آج تک پیدا نہ ہو سکا۔

''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ان کی اردو شاعری کی کتابیں ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں بھی کچھ اردو نظمیں شامل ہیں جبکہ اس کا غالب حصہ فارسی میں ہے۔ فارسی کے دیگر شعری مجموعوں میں ''پیامِ مشرق''، ''جاوید نامہ''، ''زبورِ عجم''، ''رموزِ بے خودی'' اور ''اسرارِ خودی'' شامل ہیں۔

علاّمہ محمد اقبالؒ

پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ

مقاصدِ تدریس

۱۔ اتحاد اور یک جہتی کی اہمیت اُجاگر کرنا۔
۲۔ طلبہ کو فرد اور قوم کے باہمی تعلق اور فکری ارتباط سے متعارف کرانا۔
۳۔ قومی یک جہتی کی ترویج کے ضمن میں علامہ اقبالؒ کی خدمات سے روشناس کرانا۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹُوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اُس کے واسطے
کُچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے

ہے تیرے گُلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل، زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رُخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخِ بُرِیدہ سے سبق اندوز ہو کہ تُو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالوں کے جواب دیں۔

(الف) اقبال نے ڈالی اور شجر سے کیا مُراد لیا ہے؟
(ب) عہدِ خزاں کس کے واسطے لازوال ہے؟
(ج) کس کے گلستان میں فصلِ خزاں کا دور ہے؟
(د) جیبِ گل کس چیز سے خالی ہے؟
(ہ) خلوتِ اوراق میں کون نغمہ زن تھے؟
(و) ہمیں کس چیز سے سبق اندوز ہونا چاہیے؟
(ز) اُمیدِ بہار کے لیے کس بات کی ضرورت ہے؟

۲۔ اس نظم کے قوافی کی نشان دہی کریں۔

۳۔ مندرجہ ذیل شعر کی نثر بنائیں۔

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رُخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

۴۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
ڈالی	تعلق
فصلِ خزاں	طیور
واسطہ	سحابِ بہار
نغمہ زن	شجر
جیبِ گل	آشنا
شاخِ بُریدہ	زرِ کامل عیار
نا آشنا	سبق اندوز

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب اور مرکبات کے معنی بتائیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

فصلِ خزاں، سحابِ بہار، عہدِ خزاں، برگ وبار، نغمہ زن، خلوتِ اوراق، شجرِ سایہ دار، شاخِ بُریدہ، سبق اندوز، قاعدۂ روزگار، اُمیدِ بہار

۶۔ واحد کی جمع اور جمع کی واحد لکھیں۔

شجر، اوراق، طیور، نغمہ، سبق، مِلّت، رابطہ، فرد، اقوام

۷۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

خزاں، گُل، لازوال، اتفاق، اُمید

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اِعراب لگا کر ان کا تلفّظ واضح کریں۔

فصل، سحاب، بریدہ، گلستان، سبق، روزگار، خلوت، امید

۹۔ مناسب لفظ کی مدد سے مصرعے مکمل کریں۔

(الف) ملّت کے ساتھ رابطۂ .... رکھ

(ب) ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں .... سے ٹوٹ

(ج) ہے .... عہدِ خزاں اس کے واسطے

(د) جو .... تھے خلوتِ اوراق میں طیور

(ہ) ممکن نہیں ہری ہو .... بہار سے

۱۰۔ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس نظم میں فرد اور قوم کے تعلق کو واضح کیا ہے؟

۱۱۔ فرد اور قوم کے تعلق اور اتحادِ ملّت کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کے مزید چند اشعار اپنی کاپی میں لکھیں۔

۱۲۔ ''فصلِ خزاں'' اور ''رابطۂ اُستوار'' کو قواعد کی رُو سے مرکبِ اضافی کہا جاتا ہے۔ اس نظم سے مرکبِ اضافی کی مزید پانچ مثالیں تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیں۔

سرگرمیاں:

۱۔ ہر طالب علم سے علامہ اقبالؒ کی اس نظم کو چارٹ پر خوش خط لکھوائیں۔ پھر سب سے اچھے چارٹ کا انتخاب کریں اور اُسے جماعت کے کمرے میں آویزاں کریں۔

۲۔ ہر طالب علم باری باری اس نظم کو درست آہنگ اور بلند آواز سے پڑھے۔

۳۔ اتحاد و اتفاق کے موضوع پر کوئی اور نظم تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو بتائیں کہ علامہ اقبالؒ ہمارے قومی شاعر ہیں۔ تصوّرِ پاکستان کے خالق ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے قوم کو اتحاد و یگانگت کا درس دیا ہے۔

۲۔ طلبہ کو بتائیں کہ یہ نظم علامہ اقبالؒ کی ملّی شاعری کی ایک بہترین مثال ہے۔

۳۔ طلبہ سے اس نظم کی بلند خوانی کراتے ہوئے، انھیں اس نظم کے مفہوم اور مقصد سے آگاہ کریں۔

۴۔ فرد اور ملّت کے باہمی تعلق کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے مزید اشعار بتائے جائیں مثلاً:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

حصّہ غزل

میر تقی میرؔ

(۱۷۲۳ء...........۱۸۱۰ء)

میر محمد تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔ والد کا نام میر علی متقی تھا۔ آپ آگرے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سید امان اللہ سے حاصل کی، جو میرؔ کے والد کے مرید اور مُنھ بولے بھائی تھے۔ بچپن ہی میں والد اور امان اللہ کی وفات کے بعد میرؔ کو تلاشِ معاش کے لیے آگرہ چھوڑ کر دِلّی آنا پڑا۔ یہاں ایک نواب کے ہاں ملازم ہوئے۔ وہ نواب نادر شاہ کے حملے میں مارا گیا تو میرؔ آگرے لوٹ آئے لیکن اُنھیں دوبارہ دِلّی جانا پڑا۔ دِلّی میں خراب امن وامان کی وجہ سے اُنھوں نے مجبور ہو کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور باقی عمر اِسی شہر میں بسر کی۔

میرؔ کو خدائے سخن کہا گیا ہے۔ اُنھوں نے مختلف اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے مگر اِن کی پہچان غزل گوئی ہے۔ وہ بلاشبہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ خلوص، درد و غم، ترنّم اور سادگی کی بدولت اُن کی غزلیں دل پر اثر کرتی ہیں۔

ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے ہم عصر شعرا نے کیا ہے بلکہ متأخرین نے بھی انھیں سراہا ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اُن کو ''سرتاجِ شعرائے اُردو'' قرار دیا ہے۔

میرؔ کی تصانیف میں ایک خودنوشت ''ذکرِ میرؔ''، ایک تذکرہ ''نکات الشعرا''، ایک فارسی اور چھے اُردو دواوین شامل ہیں۔

غزل

مقاصدِ تدریس

۱۔ میرؔ اوراُن کے عہدِ زریں میں، اُردوغزل کے ارتقا سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو میرؔتقی میرؔ اوراُن کے اندازِ بیان سے متعارف کرانا۔

۳۔ سہلِ ممتنع کے معنی ومفہوم سے روشناس کرانا اوراردوغزل سے اس کی مختلف مثالیں دینا۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

چشمِ دل کھول اُس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

آتشِ غم میں دل بُھنا شاید
دیر سے بُو کباب کی سی ہے

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(کلیاتِ میرؔ: دیوانِ اوّل)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) اس غزل میں ردیف کون سے الفاظ ہیں؟

(ب) اس غزل میں استعمال ہونے والے کوئی سے چار قافیوں کی نشاندہی کریں۔

(ج) دوسرے شعر میں ہونٹوں کو کس سے تشبیہ دی گئی ہے؟

(د) میرؔ نے ''نیم باز آنکھوں کی مستی'' کو کیا قرار دیا ہے؟

(ہ) شاعر ''اضطراب'' کی حالت میں کیا کرتا ہے؟

۲۔ درجِ ذیل الفاظ کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

ہستی، حباب، سراب، اوقات، اضطراب، خانہ خراب، نیم باز، مستی

۳۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
ہستی	خانہ خراب
نمائش	شراب
پنکھڑی	گلاب
آنکھیں	نیم باز
حالت	کباب
دل	حباب
مستی	سراب
آواز	اضطراب

۴۔ درجِ ذیل مرکّبات، مرکب کی کون سی قسم ہیں؟

چشمِ دل، اُس کے لب، آتشِ غم، اُس کا در

۵۔ اس غزل کے مطلع اور مقطع کی نشاندہی کریں۔

۶۔ مذکر اور مؤنث الگ الگ کریں۔

ہستی، حباب، نمائش، سراب، لب، بُو، کباب، مستی، شراب

۷۔ اِعراب لگا کر تلفّظ واضح کریں:

حباب، سراب، نمائش، چشمِ دل، عالم، اضطراب، آتشِ غم، نیم باز

۸۔ متن کے مطابق درست لفظ کی مدد سے مصرعے مکمل کریں۔

(الف) نازکی اس کے .... کی کیا کہیے

(ب) پنکھڑی اک .... کی سی ہے

(ج) ہستی اپنی .... کی سی ہے

(د) بار بار اس کے .... پہ جاتا ہوں

غزل:

لغت میں غزل کے معنی ''عورتوں سے باتیں کرنا'' (سخن با زنان گفتن) یا عورتوں کی باتیں کرنا (سخن از زنان گفتن) کے ہیں۔ اصطلاح میں غزل شاعری کی وہ قسم ہے جس میں حسن و عشق کے موضوعات اور تجربات پیش کیے جاتے ہیں۔ غزل کے لہجے میں موسیقی اور ترنّم کے عناصر ہوتے ہیں۔ غزل میں مخصوص علامتیں ہوتی ہیں جو غزل کو دوسری اصناف سے ممتاز کرتی ہیں۔ غزل میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ تصوف، اخلاق اور حیات و کائنات کے مضامین بھی ملتے ہیں۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ باقی اشعار کے ہر دوسرے مصرعے میں قافیہ موجود ہوتا ہے۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے، بشرطیکہ شاعر نے اس میں اپنا تخلص برتا ہو۔

غزل کی ایک انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا ہر شعر موضوع کے اعتبار سے مکمل ہوتا ہے۔ اِس حوالے سے وہ دوسرے اشعار کا محتاج نہیں ہوتا۔

مطلع:

مطلع کے معنی نکلنے کی جگہ یا نکلنا کے ہیں۔ اصطلاح میں غزل یا قصیدے کے پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے، چونکہ غزل یا قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ جن شعروں میں یہ التزام نہ ہو وہ اشعار مطلع نہیں کہلاتے۔ مطلع کی چند مثالیں دیکھیں:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں! خوش رہو ہم دُعا کر چلے

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

مقطع:

مقطع کے لغوی معنی ختم کرنے یا کاٹنے کے ہیں۔ اصطلاح میں مقطع غزل کے آخری شعر کو کہا جاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ جس شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال نہ کرے اسے غزل کا آخری شعر کہا جائے گا، مقطع نہیں۔ مقطع کی چند مثالیں دیکھیں:

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

سرگرمیاں:

ا۔ میرؔ کی اس غزل کو زبانی یاد کریں اور اپنی کاپی میں لکھیں۔

۲۔ میر تقی میر کی کوئی اور معروف اور آسان غزل، اپنی کاپی میں لکھیں۔

۳۔ جماعت کے کمرے میں اس غزل کی درست آہنگ کے ساتھ بلند خوانی کی جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ غزل کی ہیئت کے بارے میں بتایا جائے۔

۲۔ اُردو غزل کے ابتدائی اور ارتقائی دور کا مختصر ذکر کیا جائے۔

۳۔ اس غزل کے اشعار میں موجود تشبیہوں کی وضاحت کی جائے۔

۴۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ تمام شاعروں نے میرؔ کی غزل گوئی کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں کم از کم غالبؔ کا یہ شعر لکھوایا جائے:

ریختے کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

خواجہ حیدر علی آتش

(۱۷۶۴ء.........۱۸۴۶ء)

نام حیدر علی اور تخلص آتش تھا۔ آپ فیض آباد، لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا جو دِلّی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شجاع الدولہ کے عہد میں دِلّی چھوڑ کر فیض آباد آ گئے تھے۔ ابھی آتش صغیر سِن تھے کہ والد وفات پا گئے۔ اِس لیے ان کی تعلیم و تربیت بہتر طریقے سے نہ ہو سکی۔ آتش نے نواب مرزا تقی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ اُن کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ شاعری میں مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کے اپنے ہم عصر شاعر امام بخش ناسخ سے کئی ادبی معرکے ہوئے۔ آپ قلندرانہ مزاج کے حامل تھے، اِس لیے کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔

آتش غزل گو شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کی بیشتر خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی اپنے زمانے کے دیگر شعرا کی طرح شاعری کو شاعرانہ صناعی، مرصع کاری اور الفاظ کی نگینہ کاری کہتے تھے۔ تاہم آتش کے ہاں عامیانہ و سوقیانہ پن دکھائی نہیں دیتا جو اس وقت کے لکھنوی شعرا کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ آتش کے کلام میں فقر و غنا، توکّل، تصوف، دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی، درویشانہ رنگ اور اخلاقی مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں تغزل، رجائیت، سادگی و سلاست، نادر تشبیہات و استعارات، عمدہ صنائع بدائع، رندانہ موضوعات اور آتش بیانی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

آتش کی تصانیف میں ان کا کلیات ہی اہم ہے جس میں ان کا وہ سارا کلام شامل ہے جو مختلف اصنافِ سخن کی صورت میں موجود ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش

غزل

مقاصدِ تدریس

۱۔ آتش کے عہد تک، اُردو غزل کے ارتقا سے طلبہ کو آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو آتش اور ان کے اندازِ بیان سے متعارف کرانا۔
۳۔ طلبہ کو اُردو غزل کے مضامین اور موضوعات سے روشناس کرانا۔

رُخ و زلف پر جان کھویا کیا
اندھیرے اجالے میں رویا کیا

ہمیشہ لکھے وصفِ دندانِ یار
قلم اپنا موتی پرویا کیا

کہوں کیا ہوئی عمر کیونکر بسر
میں جاگا کیا، بخت سویا کیا

رہی سبز بے فکرِ کِشتِ سخن
نہ جوتا کیا میں، نہ بویا کیا

برہمن کو باتوں کی حسرت رہی
خدا نے بتوں کو نہ گویا کیا

مزا غم کے کھانے کا جس کو پڑا
وہ اشکوں سے ہاتھ اپنا دھویا کیا

زنخداں سے آتش محبت رہی
کنویں میں مجھے دل ڈبویا کیا

(کلیاتِ آتش: جلد اوّل)

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے جواب لکھیں۔

(الف) شاعر نے ہمیشہ کس کے وصف لکھے ہیں؟

(ب) شاعر کی عمر کیسے بسر ہوئی ہے؟

(ج) شاعر نے اپنی کشتِ سخن کے بارے میں کیا کہا ہے؟

(د) برہمن کو کس بات کی حسرت رہی؟

(ہ) شاعر کا قلم کیا کام کرتا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیں۔

وصفِ دندانِ یار، فکرِ کشتِ سخن

۳۔ متن کو مدِّنظر رکھ کر کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
اندھیرا	غم
وصف	کنواں
قلم	سُخن
عمر	اُجالا
جاگا	دندان
فکر	موتی
زنخداں	بسر
مزا	سویا

۴۔ درجِ ذیل شعر میں موجود تشبیہ کے بارے میں اپنے اُستاد سے آگاہی حاصل کریں:

ہمیشہ لکھے وصفِ دندانِ یار
قلم اپنا موتی پرویا کیا

۵۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

وصف، قلم، عمر، بخت، کشتِ سخن، برہمن، زنخداں

۶۔ الفاظ کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

وصف، بخت، برہمن، زنخداں، آتش

۷۔ درجِ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

اندھیرا، جاگنا، غم، آگ

۸۔ درجِ ذیل مرکبّات کے نام لکھیں۔

رُخ و زلف، دندانِ یار، کشتِ سُخن

۹۔ غزل کو غور سے پڑھیں اور درجِ ذیل کے جواب دیں۔

(الف) اس غزل کا مطلع کون سا ہے؟

(ب) اس غزل کا مقطع کون سا ہے؟

(ج) اس غزل کی ردیف کیا ہے؟

(د) اس غزل میں موجود کوئی سے پانچ قوافی کی نشاندہی کریں۔

۱۰۔ پانچویں شعر میں شاعر نے کیا استعارہ استعمال کیا ہے؟

استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی اُدھار لینا کے ہیں۔ علمِ بیان کی اصطلاح میں کسی چیز کے معنی عاریتاً یا مستعار لے کر دوسری چیز کے لیے استعمال کرنا، استعارہ کہلاتا ہے۔ ان دونوں میں تشبیہ کا تعلق ضروری ہے۔ استعارے میں پہلی چیز کو مستعارلہ، (جس کے لیے کوئی معنی ادھار لیا جائے)، دوسری چیز کو مستعارمنہ، (جس سے معنی ادھار لیا جائے) اور دونوں کے درمیان مشترک صفت کو وجۂ جامع کہا جاتا ہے۔ استعارے میں مستعارلہ، کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس کی جگہ پر مستعارمنہ، آتا ہے۔ مستعارمنہ، اپنے حقیقی معنی نہیں دیتا، بلکہ مستعارلہ، کے معنی دیتا ہے۔ استعارے کی مندرجہ ذیل مثالیں دیکھیں:

(الف) ماں نے کہا: میرا چاند سو رہا ہے۔

(ب) اس کی پلکوں پر ستارے چمک رہے ہیں۔

(ج) پاکستانی شیروں نے بھارتی گیدڑوں کو بھگا دیا۔

(د) عرب کا چاند طلوع ہوا تو کفر کے اندھیرے چھٹ گئے۔

(ہ) پنڈی ایکسپریس نے سارے کھلاڑیوں کے چھکے چھڑا دیے۔

پہلی مثال میں چاند مستعار منہ، ہے جو بیٹے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری مثال میں ستارے کا لفظ آنسوؤں کے لیے آیا ہے۔ تیسری مثال میں پاکستانی شیر سے پاکستانی فوجی اور بھارتی گیدڑ سے بھارت کے فوجی مراد ہیں۔ چوتھی مثال میں عرب کا چاند (مستعار منہ) حضور صَلَّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے لیے مستعار لیا گیا ہے۔ آخری مثال میں پنڈی ایکسپریس پاکستان کے تیز رفتار باؤلر شعیب اختر کے لیے مستعار ہے۔ استعارے کے استعمال سے بیان میں خوب صورتی اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔

سرگرمیاں:

۱۔ آتش کی اس غزل کو خوش خط اپنی کاپی میں لکھیں۔

۲۔ آتش کی کوئی اور معروف غزل، اپنی کاپی میں نقل کریں۔

۳۔ جماعت کے کمرے میں، اس غزل کی درست آہنگ کے ساتھ بلند خوانی کی جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ غزل کے مختلف اور متنوع مضامین کا تعارف پیش کیا جائے۔

۲۔ دوسرا شعر پڑھاتے ہوئے تشبیہ کی وضاحت کی جائے۔

۳۔ چھٹا شعر سمجھاتے ہوئے بتایا جائے کہ "غم کھانا" محاورہ ہے۔ محاورے کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے مجازی پہلو سمجھائے جائیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

(۱۷۹۷ء............۱۸۶۹ء)

اصل نام اسد اللہ خاں اور تخلص غالبؔ تھا۔ آپ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ تھا۔ غالبؔ کی عمر پانچ برس تھی کہ اُن کے والد ایک لڑائی میں مارے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ کے سپرد ہوئی تھی جو انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ وہ بھی جلد ہی انتقال کر گئے تو یہ اپنی والدہ کے ساتھ دِلّی آ گئے۔ بچپن میں انھوں نے شیخ معظم سے تعلیم پائی۔ بعد میں اُنھوں نے عبدالصمد سے فارسی میں مہارت حاصل کی۔ دِلّی میں تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے ہوئی۔

مرزا غالبؔ کو پنشن ملتی تھی جس کے اضافے کے لیے اُنھوں نے کلکتے کا سفر بھی کیا، مگر اُس میں اضافہ نہ ہوا۔ چنانچہ معاشی تنگدستی کی وجہ سے ۱۸۵۰ء میں بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کی وجہ سے پنشن بھی بند ہو گئی اور شاہی ملازمت بھی جاتی رہی۔ نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور نے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا جو تاحیات انھیں ملتا رہا۔ عمر کا آخری حصہ بیماریوں میں گزرا۔ انھوں نے دِلّی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ اُردو شاعری میں اُن کا مقام بہت بلند ہے، جسے سب نے تسلیم کیا ہے۔ وہ بہت زیادہ وسعتِ نظر رکھتے تھے۔ غالبؔ ہر دور کے اہم شاعر ہیں۔ ان کی فنی عظمت کو ہر ایک نے سراہا ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کی طرح ان کی شاعری میں بھی بڑا تنوّع اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اُن کی اُردو غزل مضامین کی رنگارنگی، وسعتِ نظر، تخیل کی بلندی، پہلوداری، معنی آفرینی، نادر تشبیہات واستعارات، نئے نئے الفاظ وتراکیب، طنز وظرافت، آفاقیت اور جدتِ ادا کی بدولت بہت اعلیٰ پائے کی ہے۔ اِن خصوصیات کی بدولت اُنھیں اُردو شاعروں کی صفِ اوّلین میں ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالبؔ کی اہم تصانیف میں: ''دیوانِ غالب (اُردو)''، ''دیوانِ فارسی''، ''گلِ رعنا''، ''مہرِ نیمروز''، ''دستنبو''، ''قاطعِ برہان''، ''لطائفِ غیبی''، ''قادر نامہ''، ''عودِ ہندی'' اور ''اُردوئے معلّٰی'' شامل ہیں۔

غزل

مقاصد تدریس

۱۔ طلبہ کو مرزا غالبؔ کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو مرزا غالبؔ کے اندازِ بیان سے متعارف کرانا۔
۳۔ غالبؔ کے عہد میں اُردو غزل کے ارتقا سے روشناس کرانا۔
۴۔ غالبؔ کے شاعرانہ موضوعات کی بوقلمونی کو اُجاگر کرنا۔

دِلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مُشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی مُنھ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پُوچھو کہ مدّعا کیا ہے

ہم کو اُن سے ، وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تُم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

مَیں نے مانا کہ کُچھ نہیں غالِبؔ
مُفت ہاتھ آئے، تو بُرا کیا ہے

(دیوانِ غالبؔ)

مشق

۱۔ غالبؔ کی غزل کی روشنی میں درجِ ذیل سوالات کے جواب لکھیں:

(الف) شاعر کو کن سے وفا کی اُمید ہے؟

(ب) شاعر نے کسے ناداں کہا ہے؟

(ج) کون مشتاق ہے اور کون بیزار؟

(د) درویش کے لب پر کیا صدا ہے؟

(ہ) غالبؔ نے مقطعے میں محبوب کو اپنی کیا قیمت بتائی ہے؟

۲۔ درجِ ذیل کے معنی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

دلِ ناداں، مشتاق، بیزار، ماجرا، مُدّعا، صدا

۳۔ اِس غزل کے دوسرے شعر میں ”مشتاق“ اور ”بیزار“ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ معنوی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسے الفاظ متضاد الفاظ کہلاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے۔

نادان، دِن، نیکی، موت، آزاد

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر تلفّظ واضح کیجیے۔

مشتاق، مدعا، وفا، صدا، نثار

۵۔ اِس غزل میں جو قافیے آئے ہیں، انھیں ترتیب وار اپنی کاپی پر لکھیں۔

۶۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
درد	نثار
مشتاق	صدا
مُنھ	دوا
درویش	بیزار
جان	زبان

۷۔ متن کے مطابق درست لفظ کی مدد سے مصرعے مکمل کریں۔

(الف) .... ناداں تجھے ہوا کیا ہے

(ب) مفت ہاتھ آئے تو .... کیا ہے

(ج) یا الٰہی! یہ .... کیا ہے

(د) ہم کو اُن سے .... کی ہے امید

(ہ) کاش پوچھو کہ .... کیا ہے

(و) جان تم پر .... کرتا ہوں

(ز) اور درویش کی .... کیا ہے

۸۔ درجِ ذیل میں سے مذکر اور مؤنث الفاظ الگ الگ کریں۔

دل، صدا، جان، مدعا، دعا، ماجرا

کنایہ:

کنایہ کے لغوی معنی چھپی ہوئی بات کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں کنایہ ایسے لفظ یا لفظوں کے مجموعے کو کہا جاتا ہے جو مجازی یا غیر حقیقی معنوں کے لیے استعمال کیے جائیں۔ کنایہ کے مجازی معنی لغوی معنی سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں مگر یہ تعلق تشبیہ کا نہیں ہوتا۔ کنایہ کی چند مثالیں دیکھیں:

(الف) اس کو کالے نے کاٹا۔ کالا یہاں سانپ کا کنایہ ہے۔

(ب) بیٹے کو عرصے بعد دیکھ کر ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ کلیجہ ٹھنڈا ہونا یہاں کنایہ ہے خوشی اور راحت کے لیے۔

(ج) اپنے سفید بالوں کا کچھ خیال کرو۔ سفید بال یہاں بڑھاپے کے لیے کنایہ ہیں۔

(د) جب سے چولھا ٹھنڈا ہوا، کسی رشتے دار نے خبر نہ لی۔ چولھا ٹھنڈا ہونا غربت کے لیے کنایہ ہے۔

(ہ) وہ بڑا تنگ دل ہے۔ تنگ دل، گھٹیا اور کنجوس آدمی کے لیے کنایہ ہے۔

سرگرمیاں:

ا۔ غالبؔ کی اس غزل کو زبانی یاد کریں اور خوش خط اپنی کاپی میں لکھیں۔

۲۔ غالب کی کوئی اور معروف اور آسان غزل تلاش کرکے اپنی کاپی پر نقل کریں۔

۳۔ جماعت کے کمرے میں، ہر طالب علم سے، اس غزل کی درست آہنگ کے ساتھ بلند خوانی کرائی جائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں آسان گفتگو کی جائے، نیز اس غزل کے حوالے سے سہلِ ممتنع اور استفہامیہ انداز کی وضاحت کریں۔

۲۔ غالبؔ کی مشکل پسندی کے بارے میں بتایا جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ اُن کی آسان غزلیں بھی موجود ہیں۔

۳۔ بچوں کو بتایا جائے کہ محبت انسان کو بے لوث جذبے عطا کرتی ہے۔

۴۔ ''ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا'' یہ شعر پڑھاتے ہوئے عام نیکی، بھلائی اور احسان کا درس دیا جائے۔

بہادر شاہ ظفؔر

(۱۷۷۵ء.........۱۸۶۲ء)

بہادر شاہ خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار تھے۔ جب اُنھوں نے بادشاہت سنبھالی، تو اُس وقت مغلیہ اقتدار اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ شاہی خاندان کا فرد ہونے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے شاعرانہ طبیعت بھی پائی تھی۔ شاعری میں شاہ نصیؔر، ذوقؔ اور غالبؔ سے اصلاح لی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اقتدار ان سے چھن گیا۔ ان کے بیٹوں کو قتل کیا گیا اور اِنھیں انگریزوں نے جلاوطن کر کے رنگون (موجودہ ینگون) برما میں نظر بند کر دیا جہاں اُنھوں نے زندگی کے آخری سال انتہائی کسمپرسی میں بسر کیے۔ رنگون ہی میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

بہادر شاہ ظفؔر کے کلیات میں تیس ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ اُنھوں نے تقریباً سبھی اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی پہچان اُن کی غزل ہے، جس میں سوز و گداز اور غم کے مضامین پڑھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ زبان کی صفائی اور روزمرہ کے استعمال نے اُن کی غزل کو ایک خاص رنگ عطا کیا ہے، جس کی بدولت اُنھیں اُردو کے اچھے غزل گو شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بہادر شاہ ظفؔر کا کلیات خاصا ضخیم ہے، جو چار دواوین پر مشتمل ہے۔ کلیاتِ ظفؔر میں اُردو زبان کے علاوہ پنجابی اور پوربی زبان کے اثرات کے حامل اشعار بھی ملتے ہیں۔

غزل

مقاصدِ تدریس

۱۔ ظفؔر کے دور کی غزل کے ارتقا سے آگاہ کرنا۔

۲۔ بہادر شاہ ظفؔر کی شاعرانہ حیثیت سے روشناس کرانا۔

۳۔ طلبہ کو بہادر شاہ ظفؔر کے اندازِ بیان سے متعارف کرانا۔

لگتا نہیں ہے دِل مرا اُجڑے دیار میں
کِس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بُلبل کو باغباں سے نہ صیّاد سے گِلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

ان حسرتوں سے کَہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کُنجِ مزار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفؔر ، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کُوئے یار میں

(کلیاتِ ظفؔر)

مشق

۱۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی غزل کو سامنے رکھتے ہوئے مختصر جواب دیں۔

(الف) انسان کی عمرِ دراز کے چار دن کیسے کٹتے ہیں؟

(ب) بلبل کو باغباں اور صیّاد سے کیا گِلہ ہے؟

(ج) بلبل کی قسمت میں کیا لکھا تھا؟

(د) شاعر اپنی حسرتوں سے کیا کہنا چاہتا ہے؟

(ہ) شاعر نے اپنی کس بد نصیبی کا ذکر کیا ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ اور تراکیب کے معنی لکھیں۔

دیار، عالمِ ناپائیدار، باغباں، فصلِ بہار، کُنجِ مزار

۳۔ اِعراب کی مدد سے تلفّظ واضح کریں۔

عالم ناپائیدار، عمر دراز، صیاد، باغباں، کنج مزار

۴۔ کالم (الف) میں دیے گئے الفاظ کو کالم (ب) کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
اُجڑا دیار	کوئے یار
عمرِ دراز	شام
آرزو	دلِ داغ دار
باغباں	فصلِ بہار
قید	صیّاد
حسرتیں	انتظار
دن	چار دن
دو گز زمین	عالمِ ناپائیدار

۵۔ مقطع میں شاعر نے کس چیز کی تمنا کی ہے؟

۶۔ ظفر کی اس غزل کو غور سے پڑھیں اور درجِ ذیل کے جواب دیں۔

(الف) اس غزل کا مطلع کیا ہے؟

(ب) اس غزل کا مقطع کیا ہے؟

(ج) اس غزل کی ردیف کیا ہے؟

(د) کوئی سے چار قافیوں کی نشاندہی کریں۔

۷۔ پہلے شعر میں شاعر نے ''اجڑے دیار'' کو کس کے لیے استعارہ استعمال کیا ہے؟

۸۔ مقطع میں شاعر نے ''دو گز زمین'' کا کنایہ کس کے لیے استعمال کیا ہے؟

۹۔ اس غزل کا کون سا شعر آپ کو زیادہ پسند ہے؟ پسندیدگی کی وجہ بھی لکھیں۔

۱۰۔ متن کے مطابق مناسب لفظ کی مدد سے مصرعے مکمل کریں۔

(الف) کس کی بنی ہے عالمِ .... میں

(ب) دو .... میں کٹ گئے دو انتظار میں

(ج) بلبل کو باغباں سے نہ .... سے گلہ

(د) پھیلا کے پاؤں سوئیں گے .... میں

(ہ) دو گز زمین بھی نہ ملی .... میں

(و) دن زندگی کے ختم ہوئے .... ہو گئی

مجازِ مرسل:

اگر کسی لفظ کو حقیقی یا لغوی معنی کے بجائے غیر حقیقی یا مرادی معنوں میں استعمال کیا جائے اور حقیقی و مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق نہ ہو مگر کوئی تعلق ضرور ہو، اسے مجازِ مرسل کہا جاتا ہے۔ مجازِ مرسل کی کئی صورتیں ہیں، جیسے:

۱۔ جُز کہ کر کُل مراد لینا۔ مثال: اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ یہاں انگلیاں مجازِ مرسل ہے۔ کیوں کہ کانوں میں پوریں یا انگلی کا کچھ حصہ دیا جاتا ہے، پوری انگلی نہیں دی جاتی ہے۔

۲۔ کُل کہ کر جُز مراد لینا۔ مثال: میں پاکستان میں رہتا ہوں۔ یہاں پاکستان مجازِ مرسل ہے، کیوں کہ میرا گھر پاکستان کے کسی ایک شہر کے کسی ایک محلے میں ہے، پورے پاکستان میں نہیں۔

۳۔ ظرف کہ کر مظروف مراد لینا۔ مثال: اس نے بوتل پی۔ بوتل نہیں پی جاتی بلکہ اس میں موجود مشروب پیا جاتا ہے۔

۴۔ مظروف کہ کر ظرف مراد لینا۔ مثال: چائے چولھے پر دھری ہے۔ چائے چولھے پر نہیں دھری جاتی بلکہ پتیلی یا دیگچی دھری جاتی ہے، جس میں چائے بنتی ہے۔

۵۔ سبب کہ کر مسبب (نتیجہ) مراد لینا۔ مثال: آج بادل خوب برسا۔ بادل نہیں برستا بلکہ بارش برستی ہے۔ بادل سبب ہے اور بارش مسبب ہے۔

۶۔ مسبب (نتیجہ) کہ کر سبب مراد لینا۔ مثال: افسوس! اس کے ہاتھ سے سب کچھ نکل گیا۔ ہاتھ مسبب ہے اور اقتدار یا حکمرانی سبب ہے۔ ہاتھ سے نکل گیا یعنی اب حکومت یا اقتدار نہیں رہا۔

سرگرمیاں:

۱۔ بہادر شاہ ظفؔر کی اس غزل کو زبانی یاد کریں اور اپنی کاپی میں خوش خط لکھیں۔

۲۔ طلبہ کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ کرایا جائے۔

۳۔ ہر طالب علم سے کہا جائے کہ وہ اپنا پسندیدہ شعر جماعت کے کمرے میں سنائے۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ یہ غزل پڑھاتے ہوئے دِلّی کی بربادی اور بہادر شاہ ظفؔر کی گرفتاری کے حوالے سے معلومات دی جائیں اور خصوصاً مقطع پڑھاتے وقت رنگون میں اُن کی قید اور وفات کا ذکر کیا جائے۔

۲۔ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا خصوصاً ذکر کیا جائے اور طلبہ کو بتایا جائے کہ یہ غزل کا نہایت اہم اور بنیادی موضوع ہے۔

۳۔ تیسرے شعر میں بلبل، باغباں اور صیّاد کے استعاروں کی وضاحت کی جائے۔

فرہنگ

حصّۂ نثر

۱۔ ہجرت نبوی صَلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

ابتدائے واقعہ: واقعے کا آغاز
اجلاسِ عام: عام جلسہ
اختصار پسندی: اختصار سے کام لینا، بات کو مختصر کرنا
بوسہ گاہِ خلائق: مخلوق جہاں بوسہ دیتی ہے۔
ترکش: تیردان، تیر رکھنے کا خول
تکبیر: اللہ اکبر کہنا
جلاوطن کرنا: وطن سے نکالنا
چشمِ انتظار: انتظار کرنے والی آنکھ
حافظِ عالَم: زمانے کی حفاظت کرنے والا
دارالامان: امن کی جگہ
دعوتِ حق: حق وصداقت کی دعوت، تبلیغِ دین
رائیں: رائے کی جمع، مشورے
عداوت: دشمنی
عزم: ارادہ
فال: شگون
فرشِ گُل: پھولوں کا فرش
قتل گاہ: قتل کرنے کی جگہ
قرائن: اندازے، نشانیاں
گراں بہا: قیمتی
محاصرہ: گھیرا ڈالنا
محبوس: قیدی
معیوب: عیب والا، بُرا
نوخیز: نوجوان
وجودِ اقدس: مقدّس وجود
وحیِ الٰہی: اللہ کا پیغام جو نبیوں پر آتا ہے۔
ہدف: نشانہ
ہمہ تن: بھرپور توجہ سے

۲۔ مرزا غالبؔ کے عادات وخصائل

اشتیاق: شوق
بایں ہمہ: اس سب کے باوجود، ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے
بساط: طاقت، حیثیت
بیرنگ: بغیر ٹکٹ کے
جامہ وار: پھول دار چھینٹ
چُرٹ: رَتھ
حفظِ وضع: وضع داری کی حفاظت
حیوانِ ظریف: ہنسی مذاق کرنے والا جانور، انسان
سوغات: تحفہ، ہدیہ
سقیم: خرابی
ظرافت: ہنسی مذاق
عمائد: معززین
فرغل: روئی والا لمبا کوٹ
فواکہ: پھل
قلیل: تھوڑی، کم
کشادہ پیشانی: خوش اخلاق، ہنس مکھ
مالیدہ: ایک قیمتی کپڑا

ناقل: نقل کرنے والا، بیان کرنے والا

ندامت: شرمندگی

یگانگت: ایک ہونا، اتفاق و اتحاد

۳۔ کاہلی

اوقات بسر کرنا: زندگی کے دن کاٹنا

بہ مجبوری: مجبور ہو کر، مجبوری کے ساتھ

بے کار مباش: بے کار مت رہ

چنداں: اسی قدر، اتنی دیر

حاجت: ضرورت، خواہش

حکیمانہ: دانش مندانہ، حکمت سے بھرا ہوا

دلی قوٰی: دل کی طاقتیں، قوتیں، صلاحیتیں

طبیعتِ ثانی: دوسری عادت، پختہ عادت

قمار بازی: جوا کھیلنا

لاخراج دار: خراج یا محصول نہ دینے والے

وحشی: غیر مُہذّب، اُجڈ، جنگلی

ولایت: ملک، محکوم ملکوں کے باشندوں کے لیے ان کے آقاؤں کا ملک

۴۔ شاعروں کے لطیفے

اشتیاق: شوق، آرزو

بالیں: سرھانا

پھپھولے: چھالے

تکرار: بحث

ٹک: ذرا

خاطر جمعی: اطمینان

دَدَا: بچوں کو پالنے والی ملازمہ، کھلائی

زبان درازی: بے ہودہ گوئی

شبِ دیجور: تاریک رات

طول کھینچنا: بات کا بڑھ جانا

۵۔ نصوح اور سلیم کی گفتگو

آموختہ: سبق

بالا خانہ: اوپر کا کمرا

بسر و چشم: سر آنکھوں پر

بھلے مانس: شریف آدمی

پھڈی جوتی: نیچی ایڑھی کا جوتا

شطرنج: ایک امیرانہ کھیل کا نام ہے جس میں چھے مہرے ہوتے ہیں۔

عمرِ دراز: لمبی عمر

گنجفہ: ایک کھیل کا نام جو تاش سے کھیلا جاتا ہے۔

معقول: مناسب

منجھلا: درمیانہ

۶۔ پنچایت

بے اعتنائی کرنا: توجہ نہ دینا
تحصیلِ علم: علم کا حاصل کرنا
خاطرداریاں: خدمت کرنا
خواجہ خضر کی حیات: لمبی عمر
زانوئے ادب تہ کرنا: مودب بیٹھنا
سبز باغ دکھانا: جھوٹا وعدہ کرنا
شانِ فضیلت: بڑائی کی شان
کامل: پورا
کھیوے کرنا: پھیرے لگانا
مسند: تخت، گدی
وضع: طرز
ہبہ نامہ: وہ دستاویز یا کاغذ جس پر کوئی چیز عطا کرنے کا اقرار لکھا جائے۔

۷۔ آرام وسکون

تردّد: فکر، پریشانی
حرارت: گرمی، بخار
علیل: بیمار
مقوّی: قوّت دینے والی
نامراد: بدنصیب، محروم
نصیبِ دشمناں: دشمنوں کو نصیب ہو

نغمہ سرائی: گانا گانا
یک نہ شُد دو شُد: ایک نہیں دو، زیادہ مصیبتیں

۸۔ لہو اور قالین

آویزاں: لٹکا ہوا
تحکم: حکم کرنا
تخلیقات: فن پارے
زمین بوس: سجدہ کرنا، گرنا
شب بیداری: رات بھر جاگنا
قدرومنزلت: مقام اور مرتبہ
قلاش: مُفلس
مزیّن: آراستہ، سجایا ہوا
مُعَمّا: پوشیدہ بات، پہیلی
ملائمت: نرمی

۹۔ امتحان

اشک شوئی: آنسو پونچھنا، تسلّی دینا
امدادِ غیبی: غیب سے ہونے والی مدد
بدرجۂ اعلیٰ: اعلیٰ درجے کے ساتھ
تشفی: تسلّی، تسکین
خادم زادہ: خادم کا بیٹا
کمترین: ناچیز، معمولی، بہت چھوٹا
محویت: محو ہونا، مِٹ جانا

مختل: پریشان، بگڑا ہوا

مُستغرق: ڈوبا ہوا، بہت مصروف

نادم: شرمندہ

ممنونِ احسان: احسان مند

قہرِ درویش بر جانِ درویش: اپنے آپ پر غصّہ نکالنا

۱۰۔ ملکی پرندے اور دوسرے جانور

اَلاپ: گانا

بدنما: جو دیکھنے میں بُرا لگے، بدصورت، بدشکل

جُثّہ: جسامت

حِفظانِ صحت: صحت کی حفاظت

خُوش گُلُو: اچھی آواز والا، سُریلا

رقابت: دشمنی جو ہمسری یا ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے ہو

شیون: نالہ وفریاد، رونا دھونا

قانِع: تھوڑی چیز پر خوش رہنے والا، قناعت کرنے والا

قُفل: تالا

۱۱۔ قدرِ ایاز

امتیاز: انفرادیت، نمایاں حیثیت

اُنس: محبت، پیار

تواضع: خاطر مدارت، مہمان نوازی

خاکسارانہ: غریبانہ

شانِ نزول: نازل ہونے کی وجہ

قسّامِ ازل: ازل کے دن سے بانٹنے والا مراد اللہ تعالیٰ

معیوب: عیب والا، برا

نیم وحشت: آدھا پاگل پن (خوف اور حیرت کی کیفیت)

انتخاب: چُنا ہوا، بہترین

متنازعہ: جھگڑے والا

چوپال: دیہات کی بیٹھک جہاں سب مل بیٹھ کر صلاح مشورے کرتے ہیں۔

خفیف: ہلکا سا، معمولی سا

قباحت: بُرائی

کباڑیا: پرانی چیزوں کی خرید وفروخت کرنے والا

نامولود: جو ابھی پیدا نہیں ہوا

وجہِ گرانی: ناراضی کی وجہ، غصے کی وجہ

۱۲۔ حوصلہ نہ ہارو آگے بڑھو منزل اب کے دور نہیں

اشکبار ہونا: آنسو بہانا

سفاک: ظالم

متعین: مقرر

جڑ سے اُکھاڑنا: بالکل ختم کر دینا

حصّۂ نظم

۱۳۔ حمد

آفاق: اُفق کی جمع، آسمان کے کنارے، دنیا، جہان

بھید: راز، پوشیدہ بات

حمد سرا: حمد کہنے والا

خلعت: لِباس

رنگِ بیان: اظہار کا انداز

صبا: صبح کی ہوا، پروا

کملی: چادر، سردی سے بچاؤ کے لیے اوڑھا جانے والا کپڑا

گدا: فقیر، بھکاری، منگتا

محیط: احاطہ کرنے والا، گھیرنے والا

۱۴۔ نعت

صبا: صبح کی ہوا
طوطی: ایک خوش آواز پرندہ
تذکرہ: ذکر
یکسو: ایک جانب، ساکن
چار سُو: چار طرف
حُرمت: عزت، احترام
مکاں: مادی دنیا، جس کی حد ہے۔
لامکاں: غیر مادی جہاں، جس کی کوئی حد نہیں۔
بے داغ: داغ کے بغیر
بے خار: کانٹے کے بغیر

۱۵۔ برسات کی بہاریں

ابر: بادل
جھجھاہٹ: جگ مگ کرنے کی کیفیت، روشن، چمکنا
کاہی: ہلکا سبز رنگ
گلزار: چمن، گلشن، پھلواری
گھات: تاک، موقع، فریب، دھوکا
لہلہاہٹ: ہوا سے کھیت کے ہلنے کی کیفیت
مست: نشے میں چور، مخمور، مدہوش، مسرور

۱۶۔ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اُستوار: مضبوط، پائیدار، مستحکم
برگ وبار: درخت کے پتے اور پھل
ڈالی: شاخ، ٹہنی
سبق آموز ہونا: سبق سیکھنا
سحاب: بادل، ابر، گھٹا
شاخِ بُریدہ: کٹی ہوئی شاخ
شجر: درخت، پیڑ
عہدِ خزاں: خزاں کا موسم
قاعدہ: طریقہ، دستور، قانون، ضابطہ، رسم

حصّۂ غزل

۱۷۔ میر تقی میرؔ

آتشِ غم: غم کی آگ
اضطراب: بے چینی
اوقات: حیثیت
چشمِ پُر آب: آنسوؤں سے تر آنکھ
حباب: پانی کا بُلبُلا

۱۸۔ حیدر علی آتش

اشکوں: آنسوؤں
رُخ: چہرہ
زَنخدان: ٹھوڑی
کِشتِ سُخن: شاعری کی کھیتی
وصفِ دندانِ یار: محبوب کے دانتوں کی خوبی

۱۹۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

بیزار: ناراض، ناخوش
دلِ ناداں: ناسمجھ دِل
مدعا: مقصد، مراد، خواہش، غرض، مرضی
مُشتاق: شوق رکھنے والا
نثار کرنا: قربان کرنا، نچھاور کرنا

۲۰۔ بہادر شاہ ظفرؔ

اُجڑے دیار: ویران بستی
صیّاد: شکاری
عالمِ ناپائیدار: مٹ جانے والی دنیا
کُنجِ مزار: مزار کا گوشہ